October 1998 • No. 263 • Rs. 9

انسان کی طاقت علم سے ہے، اور حیوان
کی طاقت تشدّد سے۔
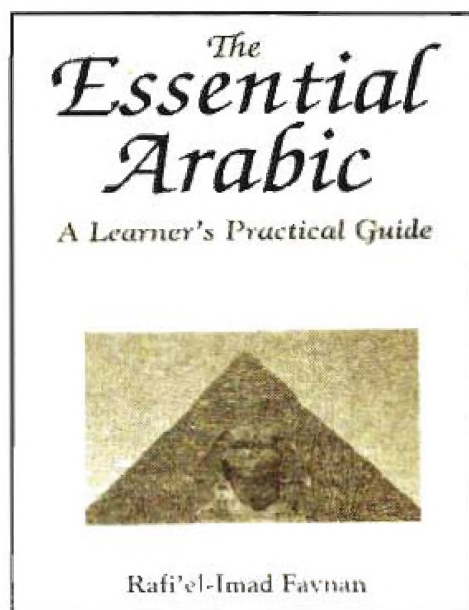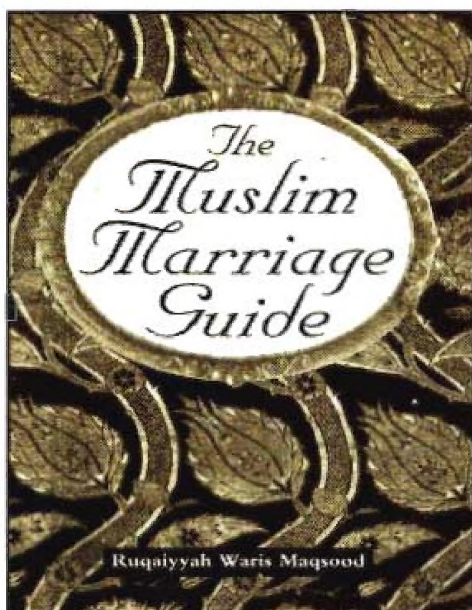
Muslim Marriage Guide

By Ruqaiyyah Waris Maqsood

Islam teaches that marriage is 'half of religion'. Because it fulfils so many basic needs of individuals and of society, it is the cornerstone upon which the whole Muslim life is built.

Modern life brings strains and pressures which can upset even the most compatible relationship. This means that nowadays, to protect the spirit of cooperation and happiness which is the sign of the true Islamic marriage, careful thought needs to be given to the mechanisms which help husband and wife to live together and respect each other's rights.

This highly-readable book takes the reader through the relevant passages in the Quran and Hadith, and goes on to discuss the main social and emotional problems that can afflict relationships, suggesting many practical ways in which these can be resolved.

ISBN 81-85063-25-7 Pages 192, Price Rs. 250

The Essential Arabic

A Learner's Practical Guide

By Rafi'el-Imad Faynan

This practical guide to modern Arabic is presented in a very simple and easy-to-grasp style. Unique in its approach, it explains the language by analyzing sample sentences in the kind of crystal clear manner which leaves a lasting impression on the reader's mind. The step-by-step approach of this easy-to-use guide will be found useful not only for beginners, but also for more advanced students. It can also be a handy tool for teachers of the language. One is finally left wondering how the hitherto dreaded learning of Arabic could have been made so delightfully simple...

ISBN 81-85063-26-5 Pages 184, Price Rs. 200

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الرسالہ
Al-Risāla

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا
اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خاں
صدر اسلامی مرکز

Al-Risāla
1, Nizamuddin West Market, Near DVB Office,
New Delhi-110013
Tel. 4611128, 4611131 Fax 4697333, 4647980
e-mail: risala.islamic@axcess.net.in
website: http://www.alrisala.org

SUBSCRIPTION RATES
Single copy Rs. 9
One year Rs. 100. Two years Rs. 195
Three years Rs. 290. Five years Rs. 480
Abroad: One year $ 20/£10 (Air mail)

DISTRIBUTED IN ENGLAND BY
IPCI: ISLAMIC VISION
481, Coventry Road, Birmingham B10 0JS
Tel. 0121-773 0137, Fax: 0121-766 8577
e-mail: info@ipci-iv.co.uk

DISTRIBUTED IN USA BY
AL-RISALA FORUM INTERNATIONAL
1439 Ocean Ave., 4C Brooklyn
New York NY 11230 Tel./Fax 718-2583435
e-mail: caleem@juno.com

Printed and published by Saniyasnain Khan on behalf of The Islamic Centre, New Delhi. Printed at Nice Printing Press, Delhi.

اکتوبر ۱۹۹۸ شمارہ ۲۶۳

فہرست — صفحہ

دانش مند کون

عن شداد بن اوس قال قال رسول الله ﷺ الکیس من دان نفسه وعمل لما بعد الموت والعا جز من اتبع نفسه هواها وتمنى على الله (المشكاة المصابيح الجزء الثالث صفحه ١٤٥٤) حضرت شداد ابن اوس کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ دانش مند وہ ہے جو نفس پر قابو رکھے اور موت کے بعد والی زندگی کے لئے عمل کرے۔ اور عاجز وہ ہے جو خواہشات کی پیروی کرے۔ اور اللہ پر جھوٹی امیدیں قائم کرے۔

جب آدمی کے اندر ایمان زندہ ہو تو اس کا حال یہ ہوتا ہے کہ زیادہ عمل کرنے کے بعد بھی وہ اپنے کو کم سمجھتا ہے۔ اس کا یہ احساس اس کو سر تاپا عمل بنا دیتا ہے۔ نیکی کے ہر موقع پر وہ نیک کرداری کا ثبوت دیتا ہے۔ اس کے لئے ناممکن ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے قول و عمل کو خدائی احکام کے تابع نہ کرے۔ اس کا زندہ ایمان اس کے لئے قول طیب اور عمل صالح کی ضمانت بن جاتا ہے۔

مگر جو لوگ ایمانی کمزوری کا شکار ہوں، ان کے اندر اس قسم کا طاقتور جذبہ باقی نہیں رہتا۔ اب خدا کے احکام ان کے رہنما نہیں ہوتے بلکہ ان کی خواہشات ہی ان کے لئے رہنما بن جاتی ہیں۔ اب انہیں یہ فکر نہیں ہوتی کہ جب بھی وہ بولیں تو سچ بولیں۔ وہ اپنے عمل کو عمل صالح کا مصداق ثابت کریں۔

اس دوسری قسم کے لوگ وہ ہیں جو انسانیت کی سطح سے گر کر حیوانیت کی سطح پر آجاتے ہیں۔ ان کو اپنی خواہشات کے سوا کسی اور چیز کی فکر نہیں ہوتی۔ وہ اپنے تمام اوقات اور اپنی تمام صلاحیتوں کو اپنی خواہشات کی تکمیل کے لئے لگا دیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے

لئے خدا کے یہاں وہ انعام نہیں جو ایک اعلی انسان کے لئے مقدر کیا گیا ہے۔

تاہم مسلم قوموں کی ایک صفت یہ ہے کہ خواہ زوال کے نتیجہ میں ان کے یہاں قول طیب اور عمل صالح باقی نہ رہا ہو۔ تب بھی اسلامی عقائد ان کے یہاں باقی رہتے ہیں مگر یہ سب کچھ رسمی سطح پر ہوتا ہے نہ کہ زندہ یقین کی سطح پر۔

اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی پوری زندگی دو عملی کی روش پر قائم ہو جاتی ہے۔ اپنی حقیقی عملی زندگی میں وہ مکمل طور پر خواہشات اور مادی مفادات کے پیرو بنے رہتے ہیں۔ اسی کے ساتھ وہ اپنی خیالی دنیا میں جھوٹی امیدوں کا ایک خود ساختہ محل بنا لیتے ہیں۔ جہاں وہ اپنے دینی عقائد کے ساتھ زندہ رہ سکیں۔ دنیوی اعتبار سے وہ پوری طرح ایک فعال زندگی گذارتے ہیں، لیکن اخروی اعتبار سے وہ صرف خوش فہمیوں میں جینے والے بن جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کا انجام یہ ہوتا ہے کہ وہ کوئی حقیقی عمل کئے بغیر ہی بڑے بڑے نتیجہ کی امید قائم کر لیتے ہیں۔ ان کا یہ ذہن بن جاتا ہے کہ ہمارے معاملات پیشگی طور پر درست ہو چکے ہیں، دنیا اور آخرت میں ہمارا کوئی معاملہ بگڑنے والا نہیں۔

آدمی بیک وقت دو چیزوں پر یکساں درجہ کی توجہ نہیں دے سکتا۔ جو آدمی آخرت کو اہمیت دے وہ آخرت سے تعلق رکھنے والی باتوں کو بے حد اہمیت دے گا۔ اس کے مقابلہ میں دنیوی چیزیں اس کی نظر میں غیر اہم ہو جائیں گی۔ اور جو آدمی دنیا کو اہمیت دے وہ دنیا کے معاملات کو بے حد سنگین سمجھے گا۔ اس کے مقابلہ میں آخرت سے تعلق رکھنے والی باتیں اس کو زیادہ اہم دکھائی نہ دیں گی۔ یہی فرق بتاتا ہے کہ کون آخرت پسند ہے اور کون دنیا پرست۔

زوجین کا درجہ

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ مردوں کو جنت میں حوریں دی جائیں گی۔ مگر عورتوں کے لیے اس قسم کا کوئی وعدہ نہیں کیا گیا۔ کیا قرآن کی اسکیم میں صرف مردوں کا حصہ ہے۔ عورتوں کا اس میں کوئی حصہ نہیں۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ قرآن میں جب کہا گیا کہ اچھے مردوں کو اچھی عورتیں دی جائیں گی تو اس میں اپنے آپ یہ مطلب شامل ہو گیا کہ اچھی عورتوں کو وہاں اچھے مرد ملیں گے۔ اس میں بیک وقت دونوں بات کہی گئی ہے۔ ایک کے لیے براہ راست انداز میں اور دوسرے کے لیے بالواسطہ انداز میں۔

قرآن میں حور کا لفظ چار بار آیا ہے۔ مگر اس سے زیادہ بار زوج کا لفظ آیا ہے۔ حور سے مراد خوب صورت عورتیں ہیں۔ اور زوج کے معنی جوڑے (spouse) کے ہیں۔ زوج میں عورت اور مرد دونوں شامل ہیں۔ اس لیے شوہر اور بیوی کے لیے زوجین کا لفظ بولا جاتا ہے۔ قرآن میں کہا گیا ہے کہ صالح مرد اور صالح عورتوں کو جنت میں داخل کیا جائے گا اور وہاں ان کو ازواج مطہرۃ (البقرہ ۲۵) ملیں گے۔ یعنی پاکیزہ جوڑے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ مردوں کے لیے پاکیزہ عورتیں اور عورتوں کے لیے پاکیزہ مرد۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ مرد و عورت دونوں ایک دوسرے کے لیے برابر کے ساتھی ہیں (آل عمران) حدیث میں ہے کہ النساء شقائق الرجال، یعنی عورتیں مردوں کا نصف ہیں۔ اس طرح اسلام میں عورت اور مرد دونوں کو یکساں مقام دیا گیا ہے۔

قرآن میں ہے کہ ایمان لانے والے مرد اور ایمان لانے والی عورتوں کو اپنے نیک اعمال کی بنا پر جنت میں داخلہ ملے گا (الاحزاب ۳۵)۔ دونوں کے اوپر یکساں طور پر عمل کی ذمہ داری ہے۔ اور دونوں کے لیے یکساں طور پر برابر کا انعام۔

اسلام میں مرد اور عورت کے درمیان حقوق اور ذمہ داریوں کے لیے کوئی فرق نہیں۔ دونوں یکساں طور پر حالت امتحان میں ہیں۔ اور دونوں کے لیے یکساں طور پر سزا یا انعام ہے۔ ان پہلوؤں سے دونوں کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ اسی طرح جو عزت و احترام ایک

کے لیے ہے، وہی عزت واحترام دوسرے کے لیے بھی ہے۔

البتہ میدانِ عمل (workplace) کے اعتبار سے دونوں میں کچھ فرق رکھا گیا ہے۔ مرد کا میدانِ عمل بنیادی طور پر باہر ہے اور عورت کا میدانِ عمل بنیادی طور پر اندر۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ عورتیں باہر نہیں نکلیں گی۔ مثال کے طور پر عورتوں کے اوپر بچوں کی تربیت کی ذمہ داری ہے۔ اب اگر عورتیں بچوں کی تعلیم کے لیے اسکول جاتی ہیں تو یہ ان کے لیے اپنے میدانِ کار کی توسیع قرار دیا جائے گا نہ کہ اس سے انحراف۔

اسلام میں عورت کا درجہ کیا ہے، اس کا اندازہ ایک حدیث سے ہوتا ہے۔ امام البخاری نے حضرت عبداللہ بن عباس سے یہ روایت نقل کی ہے۔ حضرت بریرہ کے شوہر ایک غلام تھے جن کا نام مغیث تھا۔ گویا کہ میں دیکھ رہا ہوں کہ مغیث اپنی بیوی کے پیچھے چل رہے ہیں اور ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے عباس کیا تم کو اس پر تعجب نہیں کہ مغیث کو کتنی زیادہ محبت ہے بریرہ سے اور بریرہ کو کتنا زیادہ بغض ہے مغیث سے۔ رسول اللہ ﷺ نے بریرہ سے فرمایا کہ کیا اچھا ہو کہ تم مغیث کی طرف رجوع کر لو۔ بریرہ نے کہا کہ اے خدا کے رسول کیا آپ مجھے اس کا حکم دیتے ہیں آپ نے فرمایا کہ میں صرف سفارش کر رہا ہوں۔ بریرہ نے جواب دیا: تو مجھے اس کی ضرورت نہیں (لاحاجة فيه) فتح الباری ۹ر ۳۱۹

بریرہ نے اپنے شوہر مغیث سے تفریق کرالی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے بریرہ کو مشورہ دیا کہ تم رجوع کر لو اور مغیث کے ساتھ زندگی گذارو مگر بریرہ نے آپ کے اس مشورہ کو قبول نہیں کیا۔ اور مغیث سے رجوع پر راضی نہیں ہوئیں۔

اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام میں عورت کو کتنی زیادہ آزادی حاصل ہے۔ اس کے مطابق، عورت نہ صرف مرد کے برابر ہے بلکہ اس کو یہ حق بھی حاصل ہے کہ خود پیغمبر اگر وحی کی بنیاد پر کوئی مطالبہ کرے تو وہ اس کو ماننے پر مجبور ہے۔ لیکن پیغمبر کے ذاتی مشورہ کو ماننا اس کے لئے ضروری نہیں۔

انتقام نہیں

۱۹ر جون ۱۹۹۸ کو بی بی سی لندن نے اپنے "دریافت" کے پروگرام کے تحت ایک انٹرویو نشر کیا۔ یہ انٹرویو حکیم محمد سعید صاحب (کراچی) سے لیا گیا تھا۔ حکیم سعید صاحب پاکستان کے ایک کامیاب انسان سمجھے جاتے ہیں اسی کے ساتھ وہ معیاری صحت کے مالک ہیں۔ انٹرویور کے سوالات کا جواب دیتے ہوئے حکیم صاحب نے کہا کہ میری صحت کا راز متوازن زندگی ہے۔ میں تقلیل غذا کے اصول پر عمل کرتا ہوں اور ۲۴ گھنٹہ میں صرف ایک بار کھانا کھاتا ہوں۔ میں اپنا کپڑا خود اپنے ہاتھ سے دھوتا ہوں حتی کہ اپنی شیروانی بھی۔ اپنے غسل خانہ کی صفائی میں خود اپنے ہاتھ سے کرتا ہوں۔ ایک مرتبہ اسکول کے بچوں نے ان سے پوچھا کہ جب آپ بیمار ہوتے ہیں تو کیا کرتے ہیں انھوں نے جواب دیا کہ میں بیماری کو اپنے قریب آنے کا موقع ہی نہیں دیتا۔

انھوں نے بتایا کہ ایک بار میری والدہ سخت بیمار ہوئیں اس وقت میں روم (اٹلی) میں تھا انھوں نے اطلاع بھیج کر مجھے بلوایا۔ میں فوراً واپس آیا۔ جب میں ان کے پاس پہنچا تو انھوں نے کہا کہ اب میں مرنے والی ہوں تم کو میری آخری وصیت یہ ہے کہ تم زندگی بھر کسی سے انتقام نہ لینا۔ حکیم صاحب نے کہا کہ والدہ کی یہی نصیحت میری صحت اور کامیابی کا واحد راز ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ انتقام کی نفسیات تمام انسانی خرابیوں کی جڑ ہے۔ اور انتقام نہ لینے کا مزاج تمام انسانی خوبیوں کا سرچشمہ ہے۔ آدمی اگر اسی ایک اصول کو پکڑ لے تو وہ اس کی ہمہ جہتی کامیابی کے لئے کافی ہو جائے۔

زندگی میں ہر ایک کے ساتھ ایسے واقعات پیش آتے ہیں جو اس کے اندر غصہ اور انتقام کے جذبات کو بھڑکا دیتے ہیں۔ یہ ہر آدمی کا نازک ترین امتحان ہے۔ اگر وہ غصہ اور انتقام کے راستہ پر چل پڑے تو وہ ہر لحاظ سے ناکام ہو جائے گا اور اگر وہ غصہ اور انتقام کے جذبات کو روک لے اور مثبت ذہن کے تحت اپنی زندگی کا نقشہ بنائے۔ تو وہ ہر لحاظ سے کامیاب ہو کر رہے گا۔

موجودہ دنیا میں انسان کو بہت سے لوگوں کے ساتھ مل کر رہنا ہوتا ہے۔ ان دوسرے لوگوں سے بار بار ایسے تلخ تجربے پیش آتے ہیں جو اس کی انانیت کو جگائیں اور اس کے اندر غصہ کی آگ بھڑکا دیں۔ جب کسی آدمی کا یہ حال ہوتا ہے تو اس کے بعد اس کے اندر وہی منفی کیفیت پیدا ہوتی ہے جس کو انتقام کہا جاتا ہے اس وقت آدمی معتدل حالت پر باقی نہیں رہتا۔ وہ چاہنے لگتا ہے کہ جس سے اسے تلخ تجربہ پیش آیا ہے اس کے اوپر اپنے غصہ کی آگ کو انڈیل دے، اس کو بھرپور طور پر اپنے انتقام کا نشانہ بنائے۔

اس قسم کا جذبہ پیدا ہونا بالکل فطری ہے۔ مگر اس جذبہ کو استعمال کرنا انتہائی حد تک ہلاکت خیز ہے عقل مندی یہ ہے کہ جب اس قسم کی آگ آدمی کے سینہ میں بھڑکے تو وہ اس کو اندر ہی اندر بجھانے کی کوشش کرے نہ یہ کہ اس کو ظاہر کر کے سماج میں تباہی پھیلائے اور خود بھی تباہی کا نشانہ بنے۔

ہر انتقام دوبارہ نئے انتقام کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ اس لئے اس کا حل یہ ہے کہ انتقام کے جذبہ کو پہلے ہی مرحلہ میں دبا دیا جائے۔ انتقام کا حل انتقام لینا نہیں ہے بلکہ انتقام نہ لے کر اس کو بھلا دینا ہے۔

ایک گفتگو

۲۶ رجو ۱۹۹۸ کو پٹنہ کے جناب نواب حیدر بنجارا سے (Tel: 251179) ملاقات ہوئی۔ ان کے ساتھ بہار کے ایک سابق ہندو وزیر بھی تھے۔ گفتگو کے دوران انھوں نے کہا کہ قرآن میں یہ بتایا گیا ہے کہ ہر بستی میں اور ہر قوم میں خدا کے پیغمبر آئے۔ اس بیان کے مطابق بھارت میں بھی ضرور خدا کے پیغمبر آئے ہوں گے۔ ایسی حالت میں اگر ہم رام اور کرشن اور بدھا کو پیغمبر مانیں تو اس میں کیا حرج ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ قرآن میں یہ بھی حکم دیا گیا ہے کہ پیغمبروں میں فرق نہ کرو، اور تمام پیغمبروں پر ایمان لاؤ۔ (البقرہ۔ ۱۳۶) اس لئے دوسرے پیغمبروں کو ماننا خود ہمارے عقیدہ کی تکمیل کے لئے ضروری ہے۔

میں نے کہا کہ اصولی طور پر یہ بات درست ہے۔ کہ ہر بستی اور ہر قوم میں خدا کی طرف سے آگاہ کرنے والے آئے (فاطر۔ ۲۴) حدیث کے مطابق ان خدائی فرستادوں کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ تھی۔ اجمالی ایمان کے طور پر یقیناً ہم ان تمام پیغمبروں کو مانتے ہیں مگر جب کسی شخصیت کو نام لے کر پیغمبر بتایا جائے تو ضروری ہے کہ اس کے لئے ہمارے پاس کوئی ثبوت موجود ہو، محض ذاتی قیاس کی بنا پر ہم کسی متعین شخص کو پیغمبر نہیں کہہ سکتے۔ رسالت پر ایمان کی تکمیل کے لئے تمام پیغمبروں پر نام بنام ایمان لانا ضروری نہیں، صرف مجمل ایمان سے یہ مقصد حاصل ہو جاتا ہے۔

اس معاملہ میں پہلا ذریعہ قرآن و حدیث ہے۔ مگر جب ہم قرآن کو اس نظر سے دیکھتے ہیں تو ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ قرآن میں نام لے کر جن پیغمبروں کا ذکر آیا ہے، ان کی

تعداد دو درجن سے زیادہ نہیں۔ اس لئے ان مذکورہ شخصیتوں کے بارے میں تو ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ وہ خدا کے پیغمبر تھے۔ جہاں تک دوسرے پیغمبروں کی بات ہے، ان کے بارے میں جاننے کا مزید ماخذ صرف دو ہو سکتے ہیں، تاریخ اور دوسرے مذہبوں کی مقدس کتابیں۔

جہاں تک تاریخ کا تعلق ہے، وہ پیغمبر اسلام کے سوا کسی بھی دوسرے پیغمبر کا ذکر نہیں کرتی، حتی کہ پیغمبر اسلام سے پہلے قریبی زمانہ میں آنے والے پیغمبر حضرت مسیح کا بھی نہیں۔ خالص تاریخی اعتبار سے، پیغمبر آخرالزماں کو چھوڑ کر بقیہ تمام پیغمبر غیر معلوم اور غیر مذکور شخصیتیں ہیں۔ ایسی حالت میں تاریخ کے حوالہ سے کسی پیغمبر کو پیغمبر ماننے کا سوال ہی نہیں۔

اس کے بعد دوسرا ماخذ مذہب کی مقدس کتابیں ہیں۔ اس سلسلہ میں ایک ماخذ بائبل کا ہے۔ بائبل میں کچھ ایسے نبیوں کے نام آئے ہیں جن کا ذکر قرآن میں نہیں ہے، مثلاً نحمیاہ اور یرمیاہ وغیرہ۔ چنانچہ علمائے اسلام نے بائبل کے بیان پر اعتماد کرتے ہوئے ان شخصیتوں کو بھی خدا کے پیغمبر کے طور پر تسلیم کیا ہے۔

اس کے بعد ہندوازم کو لیجئے۔ ہندوؤں کی مذہبی کتابوں کے مطابق رام اور کرشن کو مقدس شخصیت مانا جاتا ہے۔ اس بنا پر کچھ لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ رام اور کرشن کو ہمیں پیغمبر ماننا چاہیئے مگر خالص علمی اعتبار سے اس قسم کا نظریہ درست نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خود ہندو مذہب میں رام اور کرشن کو پیغمبر نہیں مانا جاتا بلکہ ان کو اوتار مانا جاتا ہے۔ اور جیسا کہ معلوم ہے، پیغمبر اور اوتار کے درمیان بنیادی فرق موجود ہے۔

اسلامی تعلیم کے مطابق، پیغمبر عام انسانوں کی طرح ایک انسان ہوتا ہے۔ اس کی

مزید خصوصیت صرف یہ ہے کہ خدا اس کو اپنے پیغام رسانی کے لئے چنتا ہے۔ اور فرشتہ کے ذریعہ اس پر اپنا کلام اتارتا ہے۔ اس کے برعکس ہندو مذہب میں جب ایک شخص کو اوتار کہا جاتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ خدا اس شخص کی صورت میں دنیا میں ظاہر ہوا۔ یہ وہی چیز ہے جس کو فلسفہ کی زبان میں تجسیم (incarnation) کہا جاتا ہے۔ اس طرح اوتار کا مطلب تجسیمی خدا (incarnate-god) ہے۔ نہ کہ اسلامی معنوں میں پیغمبر خدا۔ ایسی کسی شخصیت کو اگر اوتار کہا جائے تو یہ اسلامی عقیدہ کے خلاف ہوگا اور اگر اس کو پیغمبر کہا جائے تو ہندو عقیدہ کے خلاف۔

پھر جب خود ہندو مذہب رام اور کرشن کو پیغمبر نہ بتا رہا ہو تو ہم خود سے کس طرح ان کے اوپر پیغمبر کا لیبل لگا دیں گے۔ کسی مذہبی نظام کی کوئی شخصیت اس پہلو سے اس وقت قابل غور ہو سکتی ہے جب کہ وہ مذہبی نظام اس کے پیغمبر خدا ہونے کا دعوی کرے۔ جس شخصیت کو وہ پیغمبر خدا کی حیثیت سے پیش نہ کرے، اس پہلو سے اس کا نام سرے سے زیر بحث لایا نہیں جا سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ رام اور کرشن کو پیغمبر کہنا اتنا ہی غیر علمی ہے جتنا محمدؐ اور ابراہیم کو اوتار کہنا۔

اب گوتم بدھ کے معاملہ کو لیجئے۔ کچھ لوگ ان کو خدا کا پیغمبر بتاتے ہیں مگر یہ درست نہیں۔ اس لئے کہ گوتم بدھ کی موجود تعلیمات کے مطابق، وہ سرے سے خدا کے وجود ہی کو نہیں مانتے۔ چنانچہ بدھ مذہب کو ایک غیر خدائی مذہب (godless religion) کہا جاتا ہے۔ پھر جو شخصیت خدا کے وجود ہی کو نہ مانتی ہو اس کو خدا کا پیغمبر کس طرح کہا جائے گا۔ ایسے قول پر تو وہ مثل صادق آئے گی کہ: مدعی سست گواہ چست۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ہندوؤں نے بطور خود یہ اعلان کیا کہ گوتم بدھ ایک

اوتار تھے۔ اس طرح انھوں نے گوتم بدھ کو ہندو اوتاروں میں شامل کر لیا۔ مگر بدھ مذہب کے لوگ اس بات کو نہیں مانتے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ جب ہم خدا کے وجود ہی کو نہیں مانتے تو کیسے ممکن ہے کہ ہم گوتم بدھ کو خدا کا اوتار بتائیں۔

اوپر جو کچھ کہا گیا، اس کا تعلق صرف ان مذہبی شخصیتوں سے ہے جو پیغمبر اسلام ﷺ کے ظہور سے پہلے پیدا ہوئیں۔ پیغمبر اسلام کے بعد پیدا ہونے والی مذہبی شخصیتوں پر اس اصول کا اطلاق نہیں ہوتا۔ اسلامی عقیدہ کے مطابق، محمد ﷺ پر نبیوں کی آمد کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے۔ ایسی حالت میں آپ کے بعد پیدا ہونے والی کسی شخصیت کو اس حیثیت سے زیر غور لانا سرے سے ممکن ہی نہیں، خواہ اس نے اپنے کو پیغمبر کی حیثیت سے پیش کیا ہو یا نہ کیا ہو۔

آخری بات یہ ہے کہ جو لوگ مذکورہ قسم کا نظریہ پیش کرتے ہیں وہ اس لئے ایسا کرتے ہیں کہ وہ سمجھتے ہیں کہ اس سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان میل ملاپ پیدا ہوگا۔ مگر میل ملاپ کا تعلق اس قسم کے کسی نظریہ سے نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو مذاہب کے درمیان کبھی داخلی لڑائی نہ ہوتی۔ جیسا کہ معلوم ہے مہاتما گاندھی کو جس شخص نے قتل کیا وہ ایک ہندو تھا نہ کہ مسلمان۔ اسی طرح نواب زادہ لیاقت علی خاں کو جس نے قتل کیا وہ ایک مسلمان تھا نہ کہ ہندو۔ یہی پوری تاریخ میں جاری رہا ہے۔ میل ملاپ کی بنیاد باہمی احترام ہے نہ کہ مذہبی اشتراک۔

ایک واقعہ دو انجام

دہلی کے اوکھلا وہار کے علاقہ میں ایک تقریری پروگرام کے تحت جانا ہوا۔ نظام الدین سے اوکھلا وہار تک کے اس سفر میں مندرجہ ذیل افراد میرے ساتھ تھے: برادرم محمد خالد ندوی، مسجد کے امام قاری محمد سمیع اللہ صاحب، اور واحد علی انجینئر صاحب Tel: 6922073

۱۰؍جون ۱۹۹۸ کی شام کو میں اس مسجد میں پہنچا جس کو عام طور پر جسولا وہار کی مسجد کہا جاتا ہے۔ اس مسجد کو میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا اور نہ اس کے بارے میں مجھے کوئی واقفیت تھی۔ عشاء کے وقت جب میں وہاں پہنچا تو یہ میرے لئے ایک غیر متوقع منظر تھا۔ میں نے دیکھا کہ یہ مسجد جس کا نام اقراء مسجد ہے کسی آبادی میں نہیں ہے بلکہ ایک کھلی ہوئی جگہ پر ہے۔ گفتگو کے دوران معلوم ہوا کہ یہاں مسجد کے چاروں طرف مسلمانوں کی بہت بڑی کالونی تھی۔ اس کالونی کے اندر انھوں نے یہ مسجد بنائی تھی۔ مگر یہ کالونی غیر قانونی تھی اور دلی کے ماسٹر پلان کے خلاف بنائی گئی تھی۔ چنانچہ ۱۹۸۹ میں راجیو گاندھی کی حکومت کے زمانہ میں اس قسم کی دوسری بہت سی کالونیوں کی طرح اس کو بھی مکمل طور پر توڑ دیا گیا۔ ڈی ڈی اے کے عملہ نے بلڈوزر کے ذریعہ مسلمانوں کے ہزاروں مکانوں کو ڈھا دیا۔

آخر میں مسجد کی باری تھی مگر یہاں ایک عجیب واقعہ پیش آیا D D A کا ایک ملازم جس کا نام پنڈت شرما تھا وہ بلڈوزر کا آپریٹر تھا۔ اس نے مسجد کو بلڈوز کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے افسر نے سختی کے ساتھ حکم دیا مگر وہ راضی نہیں ہوا۔ افسر نے دھمکی

دی کہ میں تم کو ملازمت سے برخواست کردوں گا تو پنڈت شرما نے کہا کہ آپ جو چاہیں کریں، مگر میں مسجد پر اپنا بلڈوزر نہیں چلا سکتا۔ چنانچہ پوری کالونی مکمل طور پر ڈھادی گئی مگر یہ مسجد اکیلی عمارت کی حیثیت سے کھڑی رہی۔ ایک عرصے تک یہ مسجد غیر آباد پڑی ہوئی تھی۔ اب قاری محمد سمیع اللہ صاحب نے اس کو آباد کیا ہے۔ انھوں نے اس کی نئی تعمیر کر کے وہاں ایک مدرسہ بھی قائم کر دیا ہے جس کا نام مدرسۃ الحراء ہے۔

ایک طرف جسولا وہار کی یہ مسجد ہے جس کو توڑنے سے ہندو انکار کر دیتا ہے دوسری طرف ایودھیا کی مسجد ہے جس کو ہندو اقدام کر کے توڑ ڈالتا ہے۔ یہ فرق کیوں۔ اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ جسولا وہار کا ہندو ایک نارمل ہندو تھا۔ جب کے ایودھیا کا ہندو ایک غیر نارمل ہندو تھا جس کی انا کو نااہل مسلم لیڈروں نے اپنی اشتعال انگیز تقریروں سے بھڑکا دیا تھا۔ گویا کہ جسولا وہار کا ہندو اگر مسٹر ہندو تھا تو ایودھیا کا ہندو مسٹر ایگو۔ سیکڑوں سال کی تاریخ بتاتی ہے کہ مسٹر ہندو نے کبھی کسی مسجد کو نہیں توڑا مگر جب مسٹر ہندو کو بھڑکا کر مسٹر ایگو بنا دیا جائے تو اس کے بعد وہ ہوگا جو ۶؍ دسمبر ۱۹۹۲ کو ایودھیا میں پیش آیا۔

یہ واقعہ گویا اس آیت کی تفسیر ہے جس میں یہ کہا گیا ہے کہ: اگر تم صبر کرو اور اللہ سے ڈرو تو ان کی کوئی تدبیر تم کو نقصان نہیں پہونچائے گی۔ جو کچھ وہ کر رہے ہیں سب اللہ کے بس میں ہے (وان تصبروا وتتقوا لا يضركم كيدهم شئيا ان الله بما يعملون محيط) آل عمران۔ ۱۲۰۔

اس آیت کے مطابق، اس دنیا میں اصل مسئلہ کید (سازش) کی موجودگی نہیں ہے، بلکہ صبر کی غیر موجودگی ہے۔ اہل ایمان اگر صبر کی روش اختیار کریں تو خدا کی ضمانت ہے کہ مخالفین کی سازش یقینی طور پر بے اثر ہو کر رہ جائے گی۔ البتہ اگر اہل ایمان بے صبری کی

روش اختیار کریں تو سخت اندیشہ ہے کہ وہ اغیار کی سازش کی زد میں آجائیں گے۔

مذکورہ دونوں مثالیں اس کا کھلا ہوا نمونہ ہیں۔ ایودھیا کی مسجد کے معاملہ میں جذباتی لیڈروں کی رہنمائی میں مسلمانوں نے غیر صابرانہ روش اختیار کی۔ اس نتیجہ یہ ہوا کہ ایودھیا کی مسجد کو کچھ مشتعل ہندوؤں نے توڑ دیا۔ اس کے بر عکس دہلی کی مسجد کے معاملہ میں کوئی جذباتی لیڈر اشتعال دلانے کے لئے موجود نہ تھا۔ یہاں فطرت نے مسلمانوں کی رہنمائی کی چنانچہ انھوں نے صبر اور خاموشی کی روش اختیار کرلی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دہلی کی مسجد جہاں تھی وہیں بدستور قائم رہی، بلکہ سرکاری حکم کے باوجود ہندو نے اس کو توڑنے سے انکار کردیا۔

جسولاوہار کی مسجد اور ایودھیا کی مسجد کا تقابل کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ دونوں کلی طور پر ایک دوسرے کے مشابہ ہیں۔ تمثیل یا تقابل کا یہ مطلب کبھی نہیں ہوتا کہ دونوں کے درمیان کلی یکسانیت پائی جائے۔ تمثیل یا تقابل ہمیشہ دو چیزوں کے درمیان جزوی مشابہت کے اعتبار سے ہوتا ہے نہ کہ کلی مشابہت کے اعتبار سے۔

قرآن مجید میں بتوں کی مثال مکڑی سے دی گئی ہے (العنکبوت۔ ۴۱) اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بتوں میں مکڑی کی طرح پاؤں ہوتے ہیں یا وہ بھی مکڑی کی طرح جالہ بنتے ہیں۔ یہ مثال صرف ایک مشترک جزو کے اعتبار سے ہے جو دونوں کے درمیان یکساں طور پر پایا جارہا ہے اور وہ ہے کمزوری۔

دیوارِ قہقہہ

ایک پرانا قصہ ہے کہ کہیں ایک بہت لمبی اور اونچی دیوار تھی۔ جو لوگ دیوار کے اِس پار رہتے تھے انھیں دیوار کے اُس پار کا حال کچھ معلوم نہ تھا۔ چنانچہ دیوار کے اِس پار بسنے والوں کے دل میں تجسس پیدا ہوا۔ انھوں نے چاہا کہ دیوار کے دوسری طرف کا حال معلوم کریں۔

اس مقصد کے لیے ایک بہت لمبی سیڑھی بنائی گئی اور پھر ایک آدمی کو تیار کیا گیا کہ وہ اس سیڑھی پر چڑھ کر دیوار کے اوپر تک جائے اور وہاں جاکر یہ دیکھے کہ دیوار کے دوسری طرف کیا ہے۔ وہ آدمی سیڑھی کے ذریعہ دیوار کے اوپر چڑھا مگر جب اس نے اوپر پہنچ کر دیوار کے دوسری طرف کا منظر دیکھا تو وہ اتنا زیادہ بے خود ہوا کہ وہ قہقہہ لگا کر اس کی طرف کو د پڑا۔ اس کے بعد ایک اور آدمی کو اس مقصد کے لیے تیار کیا گیا مگر جب وہ اوپر پہنچا تو وہ بھی پہلے شخص کی طرح قہقہہ لگاکر دیوار کی دوسری طرف کو د گیا۔ اسی طرح بہت سے لوگ دریافت حال کے لیے دیوار پر چڑھائے گئے مگر ہر ایک قہقہہ لگاکر دوسری طرف کو دتا رہا اور دیوار کے دوسری طرف کا حال بدستور لوگوں کے لیے غیر معلوم رہا۔ اس تجربہ کی بنا پر اس دیوار کا نام دیوار قہقہہ مشہور ہو گیا۔

یہ قصہ تمثیل کی زبان میں موجودہ زمانہ کی ایک صورت حال کو بتاتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں یہ واقعہ پیش آیا کہ مسلم دنیا (یا مشرقی دنیا) کے باہر مغربی دنیا میں ایک نیا انقلاب آیا، نئے علوم پیدا ہوئے، فکر و عمل کی ایک نئی تعمیر ہوئی، یہ نئے اسباب اتنے طاقت ور تھے کہ اس کے ذریعہ اہل مغرب نے ساری دنیا پر براہ راست یا بالواسطہ غلبہ حاصل کر لیا۔

اس کے بعد مسلم دنیا یا مشرقی دنیا کے نوجوان تعلیم یا کسی اور مقصد کے تحت مغربی دنیا کی طرف جانے لگے یہ عمل پچھلے تقریباً سو سال سے جاری ہے۔ یہ مسلم نوجوان گویا وہ لوگ تھے جو مشرق اور مغرب کے درمیان قائم شدہ دیوار پر چڑھے تاکہ دوسری طرف کا حال معلوم کریں۔ وہ مغرب کو اور مغربی تہذیب کو جانیں اور پھر واپس آکر اہل مشرق کو اس سے باخبر کریں۔

مگر دوبارہ یہ ہوا کہ ان مشرقی نوجوانوں کا یہ سفر دیوار قہقہہ کی چڑھائی کے ہم معنی بن گیا۔ ان کو جب مغربی دنیا کو دیکھنے کا موقع ملا تو وہ اس سے اتنا زیادہ مسحور ہوئے کہ وہ بے تابانہ اس کی

طرف ٹوٹ پڑے۔ وہ مسلم تہذیب کے بجائے مغربی تہذیب کے دل دادہ ہو گئے۔ وہ ایسا نہ کر سکے کہ مغربی درس گاہوں میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ اسلام کی طرف لوٹیں اور اسلام کی نمایندگی کے تقاضے پورے کریں۔ وہ دنیا کی قوموں کے سامنے اسلام کے داعی بن جائیں۔ اس کے برعکس یہ ہوا کہ اسلام سے تو انھوں نے صرف رسمی قسم کا تعلق رکھا۔ عملی طور پر وہ پوری طرح مغرب اور مغربی تہذیب کے خادم بن کر رہ گئے۔

یہ صورت حال آج بہت بڑے پیمانہ پر قائم ہے۔ مسلم دنیا کے بیشتر باصلاحیت نوجوان مغربی علوم کو سیکھ کر مغرب کی سیاسی اور اقتصادی مشین کے پرزے بنے ہوئے ہیں۔ وہ بظاہر اسلام کا نام لیتے ہیں مگر عملاً وہ خدمت اسلام کے بجائے خدمت مغرب کو اپنا مقصد حیات بنائے ہوئے ہیں۔

دیوارِ قہقہہ تو شاید ایک افسانوی دیوار ہو، مگر جدید دیوارِ قہقہہ پورے معنوں میں ایک حقیقی دیوار ہے اور اسی کے ساتھ نہایت سنگین مسئلہ بھی۔ اس جدید دیوار نے اہل اسلام کے بہترین افراد کو ان سے چھین لیا ہے۔ اس نے ہمارے انتہائی لائق نوجوانوں کو خدمتِ اسلام کے میدان سے ہٹا کر خدمتِ غیر اسلام کے میدان میں سرگرم کر دیا ہے۔

اس مسئلہ کا ایک جزئی حل یہ ہے کہ ایسے ادارے قائم کیے جائیں جہاں ان نوجوانوں کو چھٹیوں کے زمانہ میں بلایا جائے اور ہر سال کم از کم ایک مہینہ ان کو یہاں گزارنے کا موقع دیا جائے۔ یہاں یہ کوشش کی جائے کہ تعلیم و تربیت کے ذریعہ انھیں اس طرح تیار کیا جائے کہ وہ جہاں ہیں وہ وہاں وَن مَین ٹومشن کے اصول پر رہ سکیں۔ یعنی اپنا معاشی کام کرتے ہوئے وہ بقدرِ امکان لوگوں کو اسلام کا پیغام بھی پہنچائیں۔

نیو یارک میں ایک بزرگ سے ملاقات ہوئی۔ وہ امان اللہ خان ولد نصیب اللہ خان ہیں۔ وہ ۱۹۲۰ میں کریم نگر میں پیدا ہوئے۔ تعلیم کے بعد سروس کے تحت حیدر آباد میں مقیم ہوگئے۔ سروس کے تحت وہ اس مکان میں رہے جس کا رقبہ ۱۰۰ + ۱۰۰ تھا۔ ان کے لڑکے اور لڑکیاں نیز کئی رشتہ دار امریکہ میں تھے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد ۱۹۸۸ میں وہ امریکہ آئے۔

انھوں نے بتایا کہ جب میں امریکہ آنے لگا تو میں نے حیدر آباد کا مکان ایک مسلمان کو کرایہ پر دے دیا۔ کچھ عرصہ کے بعد جب میں حیدر آباد گیا اور اس کے اوپر کے حصہ میں رہنا چاہا۔ تو مذکورہ مسلمان نے سیڑھیاں بند کر دیں اور مجھے مجبور کیا کہ میں مکان چھوڑ دوں۔ اب ان کا حال یہ ہے کہ وہ نہ مکان کو خالی کرتے ہیں اور نہ ٹھیک سے کرایہ ادا کرتے ہیں۔ مزید یہ کہ وہ امان اللہ خاں صاحب کو بدنام کر رہے ہیں تاکہ اپنے جرم پر پردہ ڈال سکیں۔ امان اللہ خاں صاحب واپس آکر آج کل نیو یارک میں اپنی لڑکیوں کے پاس مقیم ہیں : Tel. (718) 6390343, 2583435

حیدر آباد کا یہ واقعہ کوئی ایک واقعہ نہیں۔ اس طرح کے واقعات ہر جگہ اور ہر مسلم بستی میں ہو رہے ہیں۔ مسلمانوں میں آج کل بے شمار تحریکیں اسلام کے نام پر چل رہی ہیں۔ مگر کوئی بھی تحریک ایسی نہیں جو اس قسم کے معاملات میں دخل دے کر متعلقہ مسلمان کو ظلم اور سرکشی سے روکے۔ یہود پر اسی لیے لعنت کی گئی کہ وہ نہی عن المنکر کا یہ کام نہیں کرتے تھے۔ مسلمان اس قانون الٰہی سے مستثنیٰ نہیں۔ اگر ان کے علماء اور ذمہ دار اپنی موجودہ روش پر قائم رہیں تو کوئی بھی دوسرا عمل انھیں مذکورہ قانون کی زد میں آنے سے بچا نہیں سکتا۔

۳۱ اگست ۱۹۹۶ کو مفتی محمد سعید خاں (پیدائش ۱۹۶۱) سے ملاقات ہوئی۔ وہ پاکستان سے سیاحت کے طور پر امریکہ آئے ہوئے ہیں۔ وہ ڈٹرائٹ میں اپنے دوستوں کے ساتھ تھے۔ میری آمد کی خبر سن کر ملاقات کے لیے تشریف لائے۔ ان کے ساتھ تین اور نوجوان بھی تھے۔ یہ چاروں آدمی ڈٹرائٹ سے سات سو میل کا سفر طے کرکے فلاڈلفیا پہنچے۔ ٹیلی فون سے انھیں معلوم ہوگیا تھا کہ اس وقت میں فلاڈلفیا میں ہوں۔ یہاں ۳۱ اگست کو جناب رئیس احمد صاحب انجینیر کے مکان پر ملاقات ہوئی۔ ملاقات کئی گھنٹہ تک جاری رہی۔

انھوں نے کہا کہ میں نے آپ کی بہت سی کتابیں پڑھیں تو کچھ سوالات پیدا ہوئے۔ میں نے

چاہا کہ اس کا جواب معلوم کروں۔ سوالات انھوں نے کاغذ پر نوٹ کر رکھے تھے۔ اس کے مطابق گفتگو ہوتی رہی۔

میں نے پوچھا کہ ہمارے یہاں کی جو کتابیں آپ نے پڑھیں ان کا خلاصہ آپ نے کیا سمجھا۔ اسلام کی آئیڈیالوجی سب سے زیادہ طاقت ور آئیڈیالوجی ہے۔ جدید تحقیقات نے صرف ان کی صداقت میں اضافہ کیا ہے۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ اسلام کو آئیڈیالوجی کے اعتبار سے لے کر اٹھیں۔ اس کا مزید فائدہ یہ ہوگا کہ اسلام کو نیا خون حاصل ہوگا جس کی آج اسلام کو شدید ضرورت ہے۔

ایک سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ جہاں تک تصور دین کا تعلق ہے، دوسرے علماء سے مجھے کسی بھی قسم کا کوئی اختلاف نہیں۔ میرا سارا اختلاف صرف تدبیر کار کے بارہ میں ہے۔ میرا کہنا ہے کہ دور جدید ایک بدلا ہوا زمانہ تھا۔ ہمارے رہنماؤں کو چاہیے تھا کہ وہ عصری تقاضوں کو سمجھ کر اس کے مطابق تدابیر اختیار کرتے۔ مگر انھوں نے قدیم ذہن کے تحت اقدامات کیے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے اقدامات سے امت کو نقصان کے سوا کچھ اور نہیں ملا۔ تدبیر کار کے بارے میں یہ تنقیدی مطالعہ انتہائی ضروری ہے تاکہ ہم دوبارہ وہ غلطی نہ کریں اور آئندہ زیادہ بہتر اور صحیح منصوبہ کے تحت اپنے اقدامات کر سکیں۔

جناب رئیس احمد صاحب (فلاڈلفیا) کے مکان پر انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کا ایڈیشن ۱۹۹۲ تھا۔ اس کو جگہ جگہ سے دیکھا۔ اس کتاب کا جو ایڈیشن میرے پاس ہے اس میں کئی جگہ کالی سیاہی سے کسی تصویر یا عبارت کو مٹا دیا گیا ہے۔ مثلاً جموں اینڈ کشمیر کے عنوان کے تحت جو مضمون ہیں اس میں میری انسائیکلو پیڈیا میں ابتدائی پیراگراف مٹا دیا گیا ہے۔ اس کو حکومت ہند کے حکم کے تحت مٹایا گیا ہے۔ مگر موجودہ ایڈیشن میں وہ پورا حصہ موجود ہے۔ اسی طرح اسلام کے بارہ میں جو مضامین ہیں ان میں بھی میری انسائیکلو پیڈیا میں کئی جگہ مٹایا ہوا ہے۔ مثلاً معراج (Miraj) میں رسول اللہؐ کی تصویر تھی اس کو عربوں کے اصرار پر مٹا دیا گیا ہے، مگر یہ تمام قابل اعتراض حصے موجودہ نسخے میں موجود ہیں۔ میں نے سوچا کہ لوگوں نے اپنی آنکھوں کے سامنے سے تو اپنا غیر مطلوب منظر مٹا دیا مگر بقیہ ساری دنیا کی آنکھوں کے سامنے وہ بدستور اسی طرح اپنی پوری صورت میں موجود ہے۔ یہ ویسا ہی ہے جیسے کسی ناپسندیدہ منظر کو دیکھنے کے لیے آدمی اپنی آنکھیں بند کر لے جب کہ عین اسی وقت ساری دنیا

کی آنکھیں اس کو دیکھ رہی ہوں۔

ایک بار ایک پاکستانی خاندان اپنے عزیز کی شادی کی سالگرہ (wedding anniversary) میں جا رہا تھا۔ میں نے کہا کہ یہ بدعت شاید پاکستان سے یہاں آئی ہے۔ انھوں نے برأت ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ یہ تو پہلے سے مغربی لوگوں میں مروج تھی، ہم لوگوں نے ان سے لے لیا ہے۔ میں نے کہا کہ پاکستان ویسٹ کو اسلامائز کرنے کے لیے بنایا گیا تھا، مگر اب وہ خود اسلام کو ویسٹرنائز کرنے کا کام کر رہا ہے۔ ایک پُرشور اسلامی تحریک کا یہ انجام بھی کیسا عجیب ہے۔ ایک صاحب نے کہا کہ یہ تو باہم ملنے کے لیے ہے —— تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیے۔

ایک صاحب نے کہا کہ "انڈیا میں مسجدیں ڈھائی جا رہی ہیں ...." میں نے کہا کہ کلام کا یہ انداز بے حد غیر اسلامی ہے۔ یہ جنرلائزیشن ہے، اور جنرلائزیشن بلا شبہ اسلام میں جائز نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ انڈیا میں ایک مسجد ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو ڈھائی گئی تھی۔ مگر اسی کے ساتھ یہ بھی صحیح ہے کہ اس کے بعد بھی انڈیا میں تقریباً چار لاکھ مسجدیں محفوظ حالت میں موجود ہیں۔ انڈیا میں ایک مسجد ڈھائی گئی ہے نہ کہ مسلسل طور پر وہاں مسجدیں ڈھائی جا رہی ہیں۔

پھر میں نے کہا کہ خود امریکہ میں جہاں آپ ہیں وہاں بھی ایک مسجد کے ساتھ یہی واقعہ پیش آیا ہے۔

۳۱ اگست کی شام کو عشاء کی نماز رئیس احمد صاحب (فلاڈلفیا) کے مکان پر پڑھی گئی۔ یہاں کئی تعلیم یافتہ مرد اور عورتیں رہائش گاہ پر جمع ہو گئے۔ چنانچہ ساڑھے گیارہ بجے تک سوال و جواب کی صورت میں گفتگو ہوئی۔ ایک سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ ایک ہے کسی چیز کا شرعاً بدعت ہونا، اور دوسرا ہے اس بدعت کے خلاف دھوم مچانا۔ میں نے کہا کہ کسی چیز کے بدعت ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ فوراً اس کے خلاف پُرشور مہم شروع کر دیں۔ "بدعت" کے خلاف تحریک چلانے کا تعلق حالات سے ہے نہ کہ نفس مسئلہ سے۔ یعنی اگر مخالفانہ تحریک سے مثبت نتیجہ نکلنے کی امید ہو تو تحریک چلائی جائے گی، ورنہ خاموشی اختیار کی جائے گی۔

مفتی محمد سعید خاں صاحب (راولپنڈی) الرسالہ اور کتابوں کو بہت شوق سے پڑھ رہے ہیں۔ مگر ان کا خیال تھا کہ الرسالہ میں تنقید نہیں ہونا چاہیے۔ خاص طور پر بڑی شخصیتوں

پر تنقید سے لوگ بھڑکتے ہیں۔

میں نے کہا کہ بھڑکنے والے کون ہیں، وہ ایک محدود طبقہ ہے۔ اس وقت امت میں ایک بڑا طبقہ ان لوگوں کا ہے جو آزاد خیال ہیں۔ اس کے سامنے یہ سوال ہے کہ دور جدید میں ہمارے علماء اور رہنماؤں نے بار بار مجاہدانہ اقدامات کیے، مگر یہ اقدامات صرف مسلمانوں کی تباہی میں اضافہ کا سبب بنے۔ وہ اس ذہنی کش مکش میں مبتلا ہیں کہ کیا اسلام میں کوئی کمی ہے۔ کیا اسلام دور جدید میں صحیح رہنمائی دینے سے محروم ہے۔ یہ لوگ جب الرسالہ میں اس قسم کی تنقیدوں کو پڑھتے ہیں تو اسلام پر ان کا اعتماد از سر نو قائم ہو جاتا ہے۔ وہ ناکامی کے واقعات کو ان رہنماؤں کی تدبیر کار کی غلطی یا اجتہادی خطا قرار دے رہے ہیں نہ کہ اسلام کی کمزوری۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک عظیم الشان کام ہے۔ جس چیز کو لوگ اسلام کی کمزوری کے خانہ میں ڈالے ہوئے تھے اس کو بشری کمزوری کے خانہ میں ڈال دیا۔

۳۱ اگست کی شام کو فضل الرحمٰن صاحب، مفتی سعید صاحب وغیرہ سے پاکستان پر گفتگو ہوئی۔ فضل الرحمٰن صاحب نے کہا کہ انڈیا نے بنگلہ دیش بنوایا، ہم کیسے اس کو معاف کر سکتے ہیں۔ میں نے کہا کہ انڈیا نے بنگلہ دیش نہیں بنوایا۔ بلکہ اس نے بنگالیوں کی پاکستان کے خلاف ناراضگی کو استعمال کیا۔ محمد بن قاسم نے سندھ میں داہر کے خلاف ناراض ہندوؤں کو استعمال کیا۔ اسپین میں طارق نے شاہ کے خلاف ناراض گروپ کو استعمال کیا:

You have to know that your enemy will
fish in your troubled water.

مفتی محمد سعید خاں صاحب کا تقریباً دو دن کا ساتھ رہا۔ یکم ستمبر کی صبح کو ۹ بجے وہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ واپس گئے۔ آخر وقت میں میں نے ان سے کہا کہ آپ اپنے آخری تاثرات بتائیں۔ انھوں نے میری ڈائری پر یہ الفاظ لکھے جو بغیر کسی مزید اضافہ کے یہاں نقل کیے جاتے ہیں:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔

فکری ہلاکت کئی طرح پر واقع ہوتی ہے۔ اور اس کی ایک صورت یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی رائے پر مر مٹے اور یہ سمجھنے لگے کہ بس صرف اسی کی رائے کسی معاملے میں درست ہے اور

بقیہ سب لوگ غلطی پر ہیں۔ ایسا شخص صرف اپنے ذہنی خول میں جیتا ہے اور خارجی حالات اُس کی ذہنی سطح سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ اس لیے جب وہ کوئی فیصلہ کرتا ہے تو اپنے خول کے پاٹ اور خارجی حالات کے پاٹ میں پس جاتا ہے۔

سعید ۲ ستمبر ۱۹۹۶

امریکہ کے لیے یہ میرا پانچواں سفر تھا۔ میں نے دیکھا کہ جو لوگ اپنے ملکوں سے یہاں آئے ہیں وہ اپنے ملکوں کے مقابلہ میں یہاں زیادہ بہتر زندگی گزار رہے ہیں۔ میرا خیال تھا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اعلیٰ ذہن اپنے اپنے ملکوں سے نکل کر یہاں آتے ہیں۔ مگر اس بار تفصیلی مشاہدہ کے بعد میری رائے یہ نہیں ہے کہ استثنائی طور پر یہ افراد ایسے ہوتے ہیں جو واقعی غیر معمولی ذہن کے مالک ہوتے ہیں۔ بلکہ آنے والوں میں زیادہ تعداد اوسط ذہن کے لوگوں کی ہوتی ہے۔

میرا احساس یہ ہے کہ زیادہ بڑی وجہ یہ ہے کہ یہاں آکر لوگ زیادہ محنت کرتے ہیں۔ وہ آخری حد تک پُرامن رہتے ہوئے کام کرتے ہیں۔ وہ سسٹم سے مکمل طور پر ایڈجسٹ کر کے رہتے ہیں۔

یکم دسمبر ۱۹۹۶ کی صبح کو ہم لوگ رئیس احمد (فلاڈلفیا) کے مکان پر تھے۔ یہاں ناشتہ کا انتظام تھا۔ مفتی سعید احمد خاں صاحب وغیرہ سب مل کر ہم لوگ چھ آدمی تھے۔ نماز کے بعد چائے کے لیے بیٹھے، میز پر ڈبل روٹی کے ساتھ مکھن اور جیلی تھی۔ لوگ ایک ایک پیس اٹھا کر اس پر مکھن اور جیلی لگا رہے تھے۔ میں نے کہا کہ گھر پر میرا معمول کا ناشتہ یہی ہے۔ میری لڑکی فجر بعد مجھے دو پیس مکھن اور جیلی لگا کر دیتی ہیں، ایک گلاس پانی کے ساتھ میں اس کو کھاتا ہوں اور آخر میں ایک پیالی چائے پی لیتا ہوں۔

پھر میں نے کہا کہ اس قسم کا کام مجھے بالکل نہیں آتا۔ چنانچہ ہوائی جہاز کے سفر میں ناشتہ کے لیے ڈبل روٹی اور مکھن اور جیلی آتی ہے تو میں تینوں کو الگ الگ کھا لیتا ہوں۔ گفتگو کے دوران میں نے کہا کہ بعض باتیں نحو و صرف کے اعتبار سے درست ہوتی ہیں، مگر وہ حقیقت کے اعتبار سے غلط ہوتی ہیں۔ مثلاً اگر کوئی شخص میرے بارہ میں کہے کہ ان کو ایک پیالی چائے

بنانا یا ڈبل روٹی کی ایک پیس پر مکھن لگانا بھی نہیں آتا تو وہ قرآن کی تفسیر کیا لکھیں گے۔ تو یہ بات نحو وصرف کے اعتبار سے درست، مگر حقیقت کے اعتبار سے غلط ہوگی۔ روایات میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اشعار درست انداز میں نہیں پڑھ سکتے تھے۔ اب اگر کوئی شخص کہے کہ وہ تو ایک شعر صحیح نہیں پڑھ سکتے تو وہ قرآن کیا پڑھیں گے۔ تو یہ بات نحو وصرف کے اعتبار سے درست، مگر حقیقت کے اعتبار سے سراسر غلط بات ہوگی۔

مفتی سعید احمد صاحب سے نہایت تفصیلی باتیں ہوئیں۔ علمی گفتگوؤں کے علاوہ میرے ذاتی حالات بھی انھوں نے دریافت کیے۔ سننے کے بعد یکم ستمبر کی صبح کو انھوں نے کہا کہ آپ زندہ کیسے ہیں۔ اچانک میری زبان سے نکلا: کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میں زندہ ہوں۔

کشمیر کے لوگ ریاست کے جس حصہ کو "آزاد کشمیر" کہتے ہیں، وہاں سے کشمیری مسلمان بڑی تعداد میں یہاں آکر آباد ہوئے ہیں، اور مزید آتے رہتے ہیں۔ ایجنٹوں کو وہ اس کے لیے بڑی بڑی رقمیں دیتے ہیں۔ میں نے ایک کشمیری سے کہا کہ آپ لوگوں کا خواب آزاد کشمیر ہے۔ اس آزاد کشمیر کو پاکستان کے زیر قبضہ حصہ میں آپ بالفعل حاصل کر چکے ہیں۔ اور اب ہندستان کے زیر قبضہ علاقہ میں اس کی توسیع کی خونی لڑائی لڑ رہے ہیں۔ یہ بات صحیح ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہاں۔

پھر میں نے کہا کہ اپنے بیان کے مطابق، آپ اپنے مقصد کو کشمیر کے ایک حصہ میں حاصل کر چکے ہیں اور اسی لیے اس کو آزاد کشمیر کہتے ہیں۔ پھر اپنے اس محبوب ملک میں آپ کیوں نہیں ٹھہرے۔ اس کو چھوڑ کر آپ امریکہ میں کیوں آگئے، جس کو آپ لوگ ظالم اور کافر کہتے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ لوگوں کی تحریک اسلامی تحریک تو کیا، عام معنوں میں وہ کوئی سنجیدہ سیاسی تحریک بھی نہیں۔ ان کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہ تھا۔

آج کل امریکہ میں الکشن کا چرچا ہے۔ مگر ساری مہم بالکل مہذب انداز میں چل رہی ہے۔ ایک طرف ڈیموکریٹک پارٹی ہے جس کے امیدوار مسٹر کلنٹن ہیں۔ دوسری طرف ان کی مخالف ریپبلکن پارٹی ہے۔ ریپبلکن پارٹی نے ایک نعرہ دیا جس کو اے بی سی کہا جاتا ہے۔ یعنی: anybody but Clinton

امریکی لوگ محنتی ہیں۔ مگر اسی کے ساتھ وہ تفریح پسند ہیں۔ یکم ستمبر سے تین دن کے لیے کاروں پر اِدھر اُدھر جائیں گے اور تفریحات میں گزار کر واپس آئیں گے۔

امریکہ میں جو ایشیائی مہاجرین آئے انھوں نے اپنے بچوں کو نہ صرف انگریزی اسکولوں میں تعلیم دلائی بلکہ اپنے گھر کے اندر بھی وہ انگریزی ہی بولنے لگے۔ ان کا نظریہ تھا کہ دو زبان کے درمیان رہنے سے بچے کنفیوز ہو جائیں گے۔ ان بچوں کی زبانیں آج تقریباً ویسی ہی ہیں جیسی قدیم امریکیوں کی زبانیں ہیں۔

پانچ سال پہلے کولمبیا یونی ورسٹی نے اس معاملہ کا ایک سروے کرایا جو کئی سال تک جاری رہا۔ اس سروے کی رپورٹ ایک سال پہلے شائع ہوئی ہے۔ اس سروے کے مطابق، یک لسانی کے مقابلہ میں دو لسانی طلبہ زیادہ بہتر پائے گئے:

Bi-lingual students were much more smarter.

ایک صاحب نے اس کے خلاف بولتے ہوئے کہا کہ یہ تو سفید فام لوگوں کی ایک سازش ہے۔ انھوں نے دیکھا کہ ایشیائی طلبہ سفید فام طلبہ جیسی انگریزی بولتے ہیں تو انھوں نے سروے کا ڈرامہ کیا۔ اس طرح وہ چاہتے ہیں کہ ہم اپنے بچوں کو انگریزی کے ساتھ دوسری زبان بھی سکھائیں تاکہ ہمارے بچے اچھے انگریزی داں نہ بن سکیں اور سفید فام بچوں سے پیچھے رہیں۔

میں نے کہا کہ یہ دلیل کا جواب الزام سے دینا ہے۔ اگر آپ کو کولمبیا یونیورسٹی کی رپورٹ سے اتفاق نہیں ہے تو آپ دوبارہ ایک نیا سروے کرائیں۔ اور نئے سروے کے ذریعہ اپنی بات کو ثابت کریں۔ سروے کا جواب سروے ہے۔ الزام کبھی سروے کا جواب نہیں بن سکتا۔

میں ایک سڑک پر ٹہلنے جاتا تھا۔ یہاں سڑک کے دونوں طرف کشادہ جگہیں ہیں جہاں بنچیں لگی ہوئی ہیں۔ یہاں صبح اور شام کو لوگ آکر بیٹھتے ہیں۔ ایک روز یہاں ایک سفید فام امریکن سے گفتگو ہوئی۔ پہلے میں نے یہاں کے سسٹم کی تعریف کی۔ پھر میں نے کہا کہ آپ کا ایک مائنس پوائنٹ ہے جو پوری نیشن کے لیے خطرہ بن سکتا ہے۔ اور وہ ہے فریڈم کا لامحدود تصور۔ میں نے کہا کہ اس دنیا میں ہر چیز کی ایک حد (Limit) ہوتی ہے۔ اور آپ لوگ بھی ہر معاملہ میں اس حد کو مانتے ہیں۔ مگر فرد کی آزادی کے تصور کو آپ لوگ بے قیدی اور عورت

اور مرد کے درمیان فری کسنگ تک لے گئے ہیں۔ آخر یہاں بھی آپ لوگ حد کو کیوں نہیں قائم کرتے۔
اس نے کہا کہ ہم تو حد کو قائم کیے ہوئے ہیں۔ اور وہ یہ ہے کہ آزادی اس وقت تک جب تک وہ دوسرے کی آزادی میں دخل اندازی نہ بنے :

Freedom until infringement upon others' freedom.

پھر گفتگو کے درمیان اسلام اور مغربی تہذیب کا تقابل کرتے ہوئے میں نے کہا کہ آپ لوگ صرف ایک حد کو مانتے ہیں، اور وہ ہے ڈائرکٹ دخل اندازی۔ مگر اسلام میں ڈائرکٹ کے سوا ایک اور حد کو بھی تسلیم کیا گیا ہے، اور وہ ہے اِن ڈائرکٹ دخل اندازی۔ مثلاً ایک عورت اور ایک مرد اگر انفرادی سطح پر ایک دوسرے پر دست درازی نہ کر رہے ہوں تو آپ کے نزدیک اس کے بعد سب کچھ جائز ہے۔ مگر اسلام اسی کے ساتھ یہ بھی دیکھتا ہے کہ انفرادی آزادی کے استعمال کے اثرات سماجی اور قومی دائرہ میں کیا ہوں گے۔ گویا اسلام نے حد کے تصور کو بالواسطہ اثرات تک وسیع کیا ہے۔ اس نے میری بات کے وزن کو تسلیم کرتے ہوئے کہا : (I think you are right)

۲ ستمبر کو ایک واقعہ ہوا جو امریکہ کے تمام اخباروں میں چھپا۔ یہاں کے ٹمپا ایرپورٹ (Tampa International Airport) پر ایک شخص یو ایس ایر کے جہاز پر سوار ہونے والا تھا۔ مگر اس کا سامان جب ایرپورٹ کے کنویر بلٹ (Conveyor belt) سے گزرا تو اس کے ساتھ لگی ہوئی ایکسرے مشین نے بتایا کہ اس کے اندر دھماکہ خیز اشیاء اور گن ہیں۔ مسافر کو فوراً گرفتار کر لیا گیا۔ یہ ایک ۲۱ سالہ نوجوان رگمین (Roman Regman) تھا۔ وہ ایک مسیحی سیمنری کا طالب علم ہے۔ ریکارڈ کے مطابق وہ ایک گڈ اسٹوڈنٹ تھا۔

یہاں اس طرح کے کئی واقعات ہوئے ہیں جس میں اسلحہ یا بم پکڑا گیا ہے۔ مگر اس میں مسلمان ملوث نہ تھے۔ اس طرح مسلمانوں کی تشدد پسند تصویر میں کسی قدر کمی واقع ہوئی ہے۔

۳ ستمبر کی شام کو ہم لوگ بروکلین پبلک لائبریری دیکھنے کے لیے گئے۔ گیٹ پر پہنچے تو اندر سے ایک سفید فام شخص نکل رہا تھا۔ یہاں عام طور پر لوگ اچانک سوال کرنا پسند نہیں کرتے۔ مگر میرے مختلف حلیہ اور میری پگڑی کو دیکھ کر وہ چپ نہ رہ سکا۔ میرے ساتھی

جناب کلیم الدین صاحب جو پتلون پہنے ہوئے تھے ان سے کہا کہ کیا یہ سکھ ہیں :

Is he a Sikh?

سکھ بہت چھوٹی اقلیت ہیں۔ مگر انھوں نے اپنی شناخت ساری دنیا میں اس طرح قائم کر رکھی ہے کہ وہ دور سے پہچانے جاتے ہیں۔ لائبریری میں داخل ہوئے۔ یہ ایک محل نما تین منزلہ عمارت تھی۔ اس میں ہر قسم کی سہولتیں اور انتظامات اعلیٰ معیار کے ساتھ موجود تھے۔ تیسری منزل پر مذہب کا شعبہ تھا۔ وہ بھی کافی جامع تھا۔ میرے ذہن نے امریکہ کی اس پبلک لائبریری کا تقابل دہلی کی پبلک لائبریری سے کیا تو دہلی کی لائبریری اس کے مقابلہ میں ایسی نظر آئی جیسے راشٹرپتی بھون کی لائبریری کے مقابلہ میں کسی جھگی جھونپڑی کی لائبریری۔

یہاں ہر قسم کی کتابیں مفت پڑھنے کے لیے دی جاتی ہیں۔ لائبریری کی وسیع دنیا میں ہر قسم کی علمی سہولتیں موجود ہیں۔ ہر ضرورت کے لیے کثرت سے کمپیوٹر لگے ہوئے ہیں، آپ خود انھیں استعمال کریں، لائبریری کے عملہ کی مدد سے ان سے فائدہ اٹھائیں۔

میں نے کمپیوٹر کے دو تجربے کیے۔ پچھلے سالوں میں (Living with Islam) کے عنوان سے مغربی جرائد میں کئی مقالے شائع ہوئے ہیں۔ ہم نے کمپیوٹر سے اس کے حوالے پوچھے۔ بٹن دباتے ہی اس کی اسکرین پر تمام حوالے آ گئے۔ پھر ہم نے ایک اور بٹن دبائی تو ساتھ لگی ہوئی مشین پر ہلکی آواز شروع ہوئی اور ایک مقالہ کا پورا پرنٹ آؤٹ نکل کر باہر آ گیا۔ پھر دوبارہ بٹن دبائی تو اس نے ایک اور مقالے کا مکمل پرنٹ آؤٹ نکال کر ہمیں دے دیا :

۱۔ دی اکونومسٹ ۴ اپریل ۱۹۹۲

۲۔ دی اکونومسٹ ۱۸ مارچ ۱۹۹۵

یہاں کچھ لوگوں نے زبانی طور پر ایک قصہ بتایا۔ یہ ایک سفید فام عورت سوسن اسمتھ (Susan Smith) کا قصہ تھا۔ میں اس قصہ کو حوالے اور تاریخ کے ساتھ زیادہ متعین صورت میں جاننا چاہتا تھا۔ مجھے عورت کا نام معلوم نہ تھا۔ یہاں کی ایک خاتون کارکن سے ذکر کیا تو اس نے فوراً اس کا نام بتا دیا۔ اب کمپیوٹر پر یہ نام بتایا گیا اور فوراً ہی اسکرین پر اس کے بارہ میں تفصیلی معلومات آنا شروع ہو گئیں۔ اس واقعہ کی رپورٹیں اور اس کے بارہ میں آرٹیکل کثرت

Brooklyn Public Library

سے کمپیوٹر کے اندر فیڈ کیے ہوئے تھے۔ کمپیوٹر نے ان سب کی معلومات ہم کو دینا شروع کر دیا۔ آخر میں ہم نے دو رپورٹوں کو حاصل کرنے کے لیے کمپیوٹر کا بٹن دبایا۔ اگلے ہی لمحہ پاس رکھی ہوئی مشین پر اس کا پرنٹ آؤٹ نکل کر باہر آگیا۔

یہ واقعہ امریکہ کی سفید فام نسل کے لیے ایک بے حد شرم ناک واقعہ ہے۔ مگر وہ کسی کمی بیشی کے بغیر اپنی مکمل صورت میں کمپیوٹر کے خزانہ میں موجود تھا اور کوئی بھی آدمی کسی بھی وقت اس کو بلا قیمت حاصل کر سکتا تھا۔ یہی آزادی اور موضوعیت مغربی ملکوں کی سب سے بڑی طاقت ہے۔

یہاں میں نے ایک غیر یہودی سے پوچھا کہ امریکہ میں یہودی اتنا زیادہ چھائے ہوئے ہیں۔ اس کا سبب کیا ہے اور ان کی طاقت کا راز کیا ہے۔ اس نے کہا کہ جہاں تک میرا خیال ہے، یہودیوں پر پچھلی تاریخ میں بہت مظالم ہوئے۔ خود امریکہ میں بھی شروع شروع میں عیسائی ان پر بہت زیادتیاں کرتے تھے۔ اس کے نتیجہ میں یہودیوں میں ایک قسم کا جذبۂ بقا (survival instinct) پیدا ہو گیا۔ چنانچہ وہ ہر معاملہ میں ذمہ داری اپنے آپ پر لیتے ہوئے جینے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ یہاں ملک کی قوت کے لیے بہت کام کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ دینے والا سماج (giver society) بن گئے ہیں۔ اس طرح دھیرے دھیرے ان کے خلاف نفرت ختم ہو گئی۔

ایک طالب علم سے بات کرتے ہوئے معلوم ہوا کہ یہاں کے اچھے اسکولوں میں بالکل غیر متعصبانہ ماحول ہے۔ مثلاً کوئی یہودی نوجوان اگر ایک واقعہ کو لے کر عربوں کی برائی بتائے تو فوراً کوئی بول دے گا کہ —— تم جنرلائزیشن کر رہے ہو۔ تم کو آبجکیٹو رہنا چاہیے۔ اس طرح یہاں کے طالب علم کے اندر متعصبانہ ذہن پرورش نہیں پاتا۔

مذکورہ اسباب کی بنا پر میری رائے ہے کہ مغربی تہذیب دجال کا ظہور نہیں، اپنے امکانات کے اعتبار سے وہ اسلام کے حق میں تائید الٰہی کا ظہور ہے۔ اس نے وہ تمام اسباب پیدا کر دیے ہیں جو ادخال الکلمہ کی مہم کو کامیابی کے ساتھ چلانے کی ضرورت ہے۔ اب ہمیں یک طرفہ طور پر مدافعت کر کے وہ حالات پیدا کرنا ہے جس میں نارمل انداز میں اسلام کی اشاعت ہونے لگے۔

نیویارک ٹائمس یہاں کا بہت مشہور اخبار ہے۔ وہ (۱۸۵۱) جاری ہوا تھا۔ اس کی پیشانی پر ہر روز یہ جملہ لکھا ہوا ہوتا ہے —— تمام خبریں جو چھاپنے کے قابل ہوں :

All the news thats fit to print.

موزوں خبروں کے انتخاب کا فیصلہ کون کرے گا۔ اس کا فیصلہ اخباری انڈسٹری کا مفاد (انٹرسٹ) کرے گا نہ کہ خود خبروں کی اپنی نوعیت۔ یہیں سے اخبار یا میڈیا کا رول مکمل طور پر یک رخا ہو جاتا ہے۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ اخبار ہمیشہ شور یا دھماکہ والی خبروں کو زیادہ لیتا ہے۔ تعمیری خبروں کی اس کے نزدیک زیادہ اہمیت نہیں۔

ایک صاحب کو الرسالہ کی تنقیدوں سے اختلاف تھا۔ ان سے گفتگو کرتے ہوئے میں نے کہا کہ آپ میں اور مجھ میں جو فرق ہے وہ صرف یہ کہ آپ لوگوں نے اپنے اکابر کو معیار بنایا ہے اور ہم نے اصحاب رسولؐ کو معیار بنایا ہے۔ انھوں نے اپنے دفاع میں کچھ باتیں کہیں۔ مثلاً یہ کہ کیا اکابر غلطی پر تھے۔ میں نے کہا کہ آپ یا کوئی شخص جو بھی کہے، میں اللہ کے فرشتوں کے سامنے جو الفاظ ریکارڈ کرانا چاہتا ہوں وہ یہی ہے کہ اس وقت جب کہ لوگ اپنے اکابر کو معیار بنائے ہوئے تھے، میں نے اعلان کیا کہ اے مسلمانو، اصحاب رسولؐ کو معیار بناؤ۔

پھر میں نے کہا کہ آپ کا طریقہ عملی طور پر ممکن نہیں۔ کیوں کہ اکابر کی کوئی ایک قسم نہیں۔ ہمارے یہاں درجنوں الگ الگ حلقے ہیں اور ہر حلقہ کے اپنے اکابر ہیں۔ اور ہر ایک اپنے ہی اکابر کو معیار سمجھتا ہے۔ پھر آپ کیسے یہ طے کریں گے کہ فلاں گروہ کے اکابر کو مانو اور فلاں گروہ کے اکابر کو نہ مانو۔ مگر اصحابِ رسولؐ کا تو ایک ہی گروہ ہے۔ ان کو معیار ماننے کی صورت میں اس قسم کا کوئی مسئلہ سرے سے پیدا نہیں ہوتا۔

آج کل پریسیڈنٹ کلنٹن کی ایک کتاب چھپی ہے۔ یہ کتاب ۱۸۰ صفحہ پر مشتمل ہے اور اس کتاب کا نام یہ ہے :

Between Hope and History: Meeting America's Challenges for the 21st Century.

یہ کتاب الکشن کے مقصد کے تحت لکھی گئی ہے جو نومبر ۱۹۹۶ میں ہونے والا ہے۔ یہاں کتنا زیادہ فکری آزادی ہے۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوتا ہے کہ ۴ ستمبر کو میں نے ایک تعلیم یافتہ امریکی سے اس کا ذکر کیا تو اس نے اس کو مایوسانہ (disappointing) قرار دیا۔ اس نے کہا کہ

لٹرری پوائنٹ آف ویو سے وہ ایک معمولی کتاب ہے۔ اس کتاب میں مشکل سے ایسی کوئی سطر ہے جو کہ نومبر الکشن کے بعد یاد رکھی جاسکے :

There is hardly a line in it that will be remembered beyond the November election.

۱۹۹۱ کی خلیجی جنگ میں سابق صدر امریکہ جارج بش نے عراق کے صدر صدام حسین کو یا ان کی فوج کو آخری حد تک تباہ کرنے سے پہلے چھوڑ دیا تھا۔ اب صدام حسین نے دوبارہ کردستان (جنوبی عراق) میں اپنی فوجیں داخل کردیں۔ اس کے فوراً بعد صدر کلنٹن کے حکم سے امریکی فوجوں نے عراق پر میزائل کے ذریعہ حملے کیے۔ یہ حملے ستمبر ۱۹۹۶ کے آغاز میں کیے گئے جب کہ میں امریکہ میں موجود تھا۔

تاہم اس بار یہ معاملہ بے حد نازک ہے۔ چنانچہ صدر کلنٹن کو ابھی وہ عالمی تائید نہیں ملی ہے جو جارج بش کو اپنے فوجی اقدام پر مل گئی تھی۔ اس کی کم از کم ایک وجہ وہ ہے جو ایک امریکی پروفیسر نے بتائی۔ اس نے کہا کہ صدام کو روکنا بہت ضروری ہے۔ مگر اس بار ہماری پوزیشن بہت زیادہ مضبوط نہیں، کیوں کہ اس بار صدام خود اپنے ملک میں ہے :

But we're not on very firm ground this time because he is in his own country.

نیویارک میں جناب محمد ابراہیم شیخ (Tel. 718-252-7266) سے ملاقات ہوئی۔ انھیں الرسالہ مشن سے مکمل اتفاق ہے۔ وہ الرسالہ اور کتابوں کو ۲۰ ــ ۲۰ بار پڑھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ مستقبل میں الرسالہ اتنا پھیلے گا کہ وہی مسلمانوں کا عمومی فکر بن جائے گا۔

ان کی اہلیہ ایک امریکی نومسلمہ ہیں۔ ان کا نام زرینہ شیخ ہے۔ ان سے میں نے پوچھا کہ اسلام کی طرف آپ کو کیسے رغبت ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ اسلام قبول کرنے سے پہلے انھیں محسوس ہوتا تھا کہ ان کی زندگی میں کوئی چیز مفقود ہے۔ اس مفقود چیز کو انھوں نے اسلام میں پالیا :

Before embracing Islam, there was something missing that she found in Islam.

نماز ظہر کے بعد ہم لوگ اسلامک سنٹر سے روانہ ہو کر عبید الرحمن خاں صاحب کے مکان پر گئے۔ یہاں کچھ آدمی اکٹھا ہو گئے۔ عصر تک گفتگو کا سلسلہ جاری رہا۔ ایک بات میں نے یہ کہی کہ یہاں کے مسلمان اپنی نئی نسل کے بارہ میں بہت متردد رہتے ہیں۔ ان کو ڈر ہے کہ ان کی اگلی نسل "اسلامی شناخت" کو کھو دے گی۔ مگر میں ان لوگوں کے بارہ میں بہت زیادہ پُر امید ہوں۔ مگر مروجہ اسلامی شناخت یا ملی شناخت دراصل تاریخی شناخت ہے۔ وہ اس اسلام کی شناخت نہیں جو رسولؐ اور اصحاب رسولؐ کے زمانہ میں پایا جاتا تھا۔

میں نے کہا کہ قدیم نسل کنڈیشننگ کی وجہ سے اصلی اور فطری اسلام کو سمجھنے سے قاصر رہتی ہے۔ نئی نسل اس قسم کے ذہنی بوجھ سے آزاد ہے۔ اس لیے خالص اور بے آمیز اسلام کو زیادہ سمجھ سکتی ہے۔

امریکہ میں انگریزی کتابوں کا ایک سیلاب آیا ہوا ہے۔ سب سے زیادہ لٹریچر غالباً سلفی حضرات کی طرف سے فلڈ کیا گیا ہے۔ اس کے بعد صوفی لٹریچر کا نمبر ہے۔ اور پھر مختلف تحریکوں اور تجارتی اداروں کے شائع کردہ لٹریچر ہیں۔ تاہم میرا احساس ہے کہ ان میں زیادہ تعداد ان کتابوں کی ہے جن میں اپنے گروہی یا ذاتی رجحانات کی تبلیغ کی کوشش کی گئی ہے۔ اسلام کو موضوعی انداز میں پیش کرنے والی کتابیں نسبتاً بہت کم ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود اسلام لوگوں کے اندر جوش تبلیغ پیدا نہیں کرتا بلکہ "اپنا اسلام" زیادہ تبلیغی جوش پیدا کرتا ہے۔

ایک کتاب پڑھی۔ اس میں اسلامی عبادت کو جسمانی ریاضت کے ساتھ وابستہ کر کے بتایا گیا تھا کہ —— اس کا ایک جملہ یہ تھا کہ یہ بات دھیان میں رکھنا چاہیے کہ اکثر اسلامی عبادتیں مثلاً نماز اور حج جسمانی صحت کے متقاضی ہیں :

It is important to point out that many of the devotions in Islam like Salat and Hajj require a body that is physically fit. *Islam the Natural Way,* by Abdul Wahid Hamid.

مصنف نے اسلامی عبادتوں کو محض ان کے فارم کے اعتبار سے لیتے ہوئے انھیں ایک طرح کا جسمانی فعل سمجھ لیا۔ حالاں کہ اصل حقیقت یہ ہے کہ عبادات کے ساتھ جسمانی فعل کا پہلو اس کا صرف ظاہری پہلو ہے۔ اس کا حقیقی پہلو اس کی داخلی کیفیت ہے۔ اسی لیے معذور شخص کی عبادت بھی اتنی ہی کامل قرار پاتی ہے جتنی کہ ایک تندرست آدمی کی عبادت۔ حتیٰ کہ اگر معذور آدمی کی

عبادت میں داخلی کیفیت بڑھ جائے تو وہ تندرست آدمی کی عبادت سے زیادہ افضل ہو جائے گی۔

ایدھی انٹرنیشنل فاؤنڈیشن کا مرکز پاکستان میں ہے۔ مگر اس نے مختلف ملکوں میں نیز امریکہ میں بھی شاخیں کھولی ہیں۔ نیویارک برانچ کی طرف سے اس کا آرگن ویلفیر جرنل کے نام سے شائع ہوتا ہے۔ یہ بیک وقت اردو، انگریزی دونوں زبانوں میں ہوتا ہے۔ اس میں مسلسل الرسالہ کے اردو اور انگریزی مضامین شائع کیے جاتے ہیں۔ اسپین کا سفرنامہ پورا کا پورا اس جرنل نے قسط وار شائع کیا ہے۔ نیویارک کے قیام کے زمانہ میں میں نے ۱۹۹۶ کے کچھ شمارے دیکھے جن میں الرسالہ کے اردو اور انگریزی مضامین نقل کیے گئے تھے۔ یہ جرنل اخباری سائز پر ہے اور نیویارک سے چھپتا ہے (Tel. 718-6395120)

۴ ستمبر کی شام کو نیویارک کے میاں اصغر علی صاحب اور ان کے ساتھی ملاقات کے لیے آئے۔ انھوں نے سوال کیا کہ کیا وجہ ہے کہ دوسری قوموں میں بہت جلد اتفاق ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے میں سے کسی کی قیادت کو مان کر متحد ہو جاتے ہیں۔ مگر مسلمانوں میں اتفاق و اتحاد قائم نہیں ہوتا۔ وہ ہمیشہ آپس میں لڑتے ہی رہتے ہیں۔ اس بنا پر کچھ لوگ شبہ کرنے لگے ہیں کہ شاید مذہب اسلام میں کوئی خرابی تو نہیں۔

میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ میں جب مسلمانوں کا سیاسی اقتدار ختم ہوا تو ہمارے لکھنے اور بولنے والے لوگوں نے مسلمانوں کو یہ سبق دیا کہ تم دنیا کے امام ہو، اٹھو اور عالم کی امامت وقیادت سنبھال لو۔ اس طرح تمام مسلمانوں میں برتری کا جذبہ ابھار دیا گیا یہ ایک بے معنی بات تھی۔ کیونکہ زندگی میں اصل ضرورت تواضع کی ہے نہ کہ برتری کی۔ امام تو ایک ہوتا ہے۔ باقی تمام لوگوں کو مقتدی بننا پڑتا ہے۔ ۱۰ ہزار میں ۹۹۹۹ آدمیوں کو پیچھے ہٹنا پڑتا ہے، تب ایک شخص آگے بڑھ کر امامت کرتا ہے۔ اس لیے صحیح بات یہ تھی کہ لوگوں میں اطاعت کا جذبہ ابھارا جاتا۔ تواضع اتحاد کی جڑ ہے اور برتری اختلاف کی جڑ۔

انھوں نے کہا کہ انسان تو خدا کا خلیفہ ہے۔ یعنی وہ خدا کا ڈپٹی اور نائب ہے۔ پھر اس طریق تعبیر میں کیا غلطی ہے۔ میں نے کہا کہ یہ نظریہ بذاتِ خود بے اصل ہے کہ انسان خدا کا نائب اور ڈپٹی ہے۔ انسان خدا کا عبد ہے۔ اسی لیے کلمۂ شہادت میں یہ نہیں ہوتا کہ اشهد ان محمداً خليفته ورسوله

بلکہ یہ ہوتا ہے کہ اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ۔

پھر میں نے کہا کہ اس قسم کی تعبیرات کے عملی نتائج کو دیکھ کر جدید طبقہ اسلام کے بارے میں تشکیک میں پڑ گیا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ایسے لوگوں پر تنقید کرکے ان کی غلطی کو واضح کیا جائے جنھوں نے اس قسم کی تعبیرات پیش کیں۔ اگر آپ تنقید نہ کریں تو لوگ خود اسلام کے بارہ میں مشتبہ ہو جائیں گے۔ تنقید کرنا گویا اس الزام کو اسلام سے ہٹا کر کچھ افراد پر ڈالنا ہے، اور تنقید نہ کرنا گویا افراد کو بچا کر اسلام پر الزام کو باقی رہنے دینا۔

نیویارک سے نکل کر ہم لوگ الغزالی اسکول پہنچے۔ یہ ایک ہائی اسکول ہے جس کو عربوں نے قائم کیا ہے۔ یہاں لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ عرب اساتذہ بیشتر میری کتابیں پڑھے ہوئے تھے۔ اسکول میں ہال کی صورت میں ایک مسجد بھی ہے۔ اس کے دروازہ پر ایک طالب علم کے ہاتھ کا لکھا ہوا حسب ذیل کتبہ ہے: اذا دخلتَ المسجدَ فلا تجلس حتی تصلی رکعتین

(دیم عبد اللہ العبد القادر)

امریکہ میں (دوسرے مغربی ملکوں کی طرح) چائلڈ ابیوز (child abuse) کا سرکاری ادارہ ہے جو سوشل و یلفیر ڈپارٹمنٹ کے تحت کام کرتا ہے۔ وہ سرپرستوں کے مقابلہ میں بچوں کا دفاع کرتا ہے۔ کلیم الدین صاحب نے ایک دل چسپ بات بتائی۔ ان کی بچی ذکری یہاں پبلک اسکول میں پڑھتی ہے۔ ایک سال پہلے کا واقعہ ہے، وہ اسکول گئی تو اس کی خاتون ٹیچر نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں رنگ کی مانند کچھ لگا ہوا ہے۔ اس نے فوراً بچی کے والدین کو ٹیلی فون کیا۔ ان کو شبہ تھا کہ بچی کے والدین نے اس کے ساتھ کوئی زیادتی کی ہے جس کا نشان اس کے ہاتھ پر ہے ـــ والدین نے تحریری طور پر بتایا کہ بچی کے ہاتھ پر جو نشان ہے وہ دراصل مہندی کا نشان ہے جو ہمارے کلچر میں "میک اپ" کے مقصد کے تحت استعمال کی جاتی ہے تب جا کر انھیں چھٹی ملی۔

الغزالی اسکول سے پھر ایک اور صاحب کے ساتھ روانگی ہوئی۔ یہ ایک سفید فام نومسلم مسٹر عبد الرحمن تھے۔ ان کا سابق نام مسٹر بنڈر (Timothy B. Bender) تھا۔ ان کی عمر ۴۲ سال ہے اور انھوں نے اسی سال ۱۹۹۶ میں اسلام قبول کیا ہے۔ میں نے پوچھا کہ کس چیز نے آپ کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا۔ انھوں نے کہا کہ جنت کا شوق۔ میں نے پوچھا کہ اسلام قبول کرنے

کے بعد آپ خوش ہیں۔ انھوں نے کہا کہ بہت خوش (very happy)

عبدالرحمٰن صاحب کے ساتھ روانہ ہوکر ہیں ڈاکٹر سلیم اے خان کے اسٹور میں پہنچا جو ٹرنٹن ہیں واقع ہے۔ یہاں دوسری طبی چیزوں کے علاوہ آکسیجن مشین (Oxygen concentrator) سپلائی کی جاتی ہے۔ یہ ان مریضوں کے لیے ہے جو اپنی سانس کے ذریعہ بقدر ضرورت آکسیجن نہیں لے سکتے۔ یہ مشین ہوا سے آکسیجن لے کر انھیں باہر سے آکسیجن پہنچانے کا کام کرتی ہے۔

راستہ میں ایک جگہ گایوں کا فارم نظر آیا۔ مگر وہ بھی پارک کی طرح تھا۔ تمام جانور خوب صورت دیواروں کے اندر رہتے۔ کوئی جانور سڑکوں یا راستوں پر گھومتا ہوا دکھائی نہیں دیا۔ میں نے سوچا کہ گائے کے تقدس کے نام پر جھگڑے انڈیا میں ہوتے ہیں۔ اور صحیح معنوں میں گائے کا حق امریکہ میں ادا کیا جاتا ہے جو گائے کی تقدس کا قائل نہیں۔

مولانا ذکی صاحب نے بتایا کہ یہاں والنٹیر زم بہت زیادہ ہے۔ بہت سے کام (مثلاً راستوں کی صفائی اور قانون کا احترام) لوگ بالکل رضا کارانہ طور پر انجام دیتے ہیں۔ میں نے سوچا کہ امریکہ میں دوسو برس سے جمہوریت کا نظام قائم ہے۔ ہر چار سال پر بالکل پرامن طور پر حکومت بدل جاتی ہے۔ جیتنے والا حکومت چلاتا ہے، ہارنے والا اپنی ہار مان لیتا ہے۔ یہ سب اس طرح ہے کہ یہاں کا سماج تعلیم و تربیت کے نتیجہ میں اس کے لیے تیار کیا جا چکا ہے۔ اسی طرح کسی ملک میں اسلامی نظام بھی اس وقت قائم ہوگا جب کہ وہاں کے سماج کو اس کے موافق بنایا جا چکا ہو۔ سماجی تعمیر کے بغیر حکومت کی تشکیل کا خیال ایک دیوانہ پن ہے نہ کہ کوئی واقعی منصوبہ بندی۔

چلتے ہوئے ایک جگہ سڑک مڑی تو وہاں موٹے حرفوں میں ڈیڈ اینڈ (dead end) لکھا ہوا تھا۔ مولانا ذکی صاحب نے کہا کہ اسی طرح مغربی تہذیب بھی اپنے ڈیڈ اینڈ پر پہنچ چکی ہے۔ مثلاً سابق صدر جارج بش نے چھ بلین ڈالر ڈرگ کے استعمال کو روکنے پر خرچ کیے۔ مگر ایک فی صد بھی کمی نہ ہو سکی۔ ہتھیاروں کی انڈسٹری پر انھوں نے اپنی اقتصادیات کو قائم کیا۔ مگر اب اس کے مواقع دن بدن ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ فیملی لائف یہاں کی تباہ ہوگئی ہے۔ میں نے کہا کہ یہ بالکل درست ہے۔ مگر اسلام کو ان کے سامنے متبادل کے طور پر لانے کے

لیے سب سے پہلے ہمیں اپنی قومی لڑائی کو، اپنی نفرت کی پالیسی کو ختم کرنا ہوگا۔

راستہ میں ایک بڑی خوب صورت دکان دوبارہ ایک پارک نما میدان میں کھڑی ہوئی نظر آئی۔ یہ گاؤں کی گروسری (کھانے پینے کے سامان کی دکان) تھی۔ ہمارے یہاں شہروں میں بھی اس قسم کی صاف ستھری دکان نہیں۔

انھوں نے ایک صاحب کا قول بتایا کہ "مولانا مودودی اتنے بڑے ہیں کہ کوئی ان سے چھوٹا بھی نہیں"۔ میں نے کہا کہ یہ تو لفظی تُک بندی ہے۔ دوسرا شخص کہہ سکتا ہے کہ "مولانا مودودی اتنے چھوٹے تھے کہ ہر شخص ان سے بڑا ہے"۔ میں نے کہا کہ ہمارے یہاں تنقید اور تعریف دونوں میں اس طرح کے الفاظ بولنے کا رواج عام ہو گیا ہے۔ حالانکہ اس طرح کے الفاظ سے نہ کسی کا بڑا ہونا ثابت ہوتا ہے اور نہ کسی کا چھوٹا ہونا۔

پروگرام کے مطابق تھوڑی دیر کے لیے مذکورہ اسٹور پر بیٹھا۔ وہاں لوگوں سے مختصر گفتگو ہوئی۔ اس کے بعد جناب محمد ذکی الدین الشرفی آگئے۔ ان کے ساتھ روانہ ہو کر ان کے گھر پہنچا۔ یہاں غسل کیا۔ دوپہر کا کھانا کھایا اور ظہر کی نماز پڑھی۔ ذکی الدین صاحب سے نہایت مفید باتیں ہوئیں۔ پھر انھوں نے مجھ کو اسلامک سنٹر (ٹرنٹن) پہنچایا جس کے وہ ڈائرکٹر ہیں۔

ذکی الدین صاحب نہایت ذہین آدمی ہیں۔ عربی تعلیم کے بعد امریکہ آ کر انھوں نے یونیورسٹی کی تعلیم حاصل کی ہے۔ انھوں نے اپنے کئی قصے سنائے۔

دوپہر کا کھانا مولانا ذکی الدین الشرفی کے مکان پر کھایا۔ اس کے بعد ان کے صاحب زادہ محمد نقی الدین ذکی (پیدائش ۱۹۷۵) کے ہمراہ قیام گاہ (ماؤنٹ ہالی) کے لیے روانگی ہوئی۔ راستہ میں ان سے گفتگو ہوتی رہی۔

انھوں نے کہا کہ کالج میں میرے تعلقات زیادہ تر ہندو لڑکوں سے ہیں۔ ان سے اکثر مذہب پر گفتگو ہوتی ہے۔ ہندو طلبہ کہتے ہیں کہ اسلام میں ٹالرنس نہیں ہے۔ ہندو ازم کا کہنا ہے کہ سچائی صرف ہندو دھرم میں نہیں ہے۔ بلکہ سچائی ہر جگہ ہو سکتی ہے۔ مگر آپ لوگ کہتے ہیں کہ صرف اسلام ہی سچا مذہب ہے۔ اسی وجہ سے ساری لڑائی ہے۔ اگر آپ لوگ ہمارے نقطۂ نظر کو مان لیں تو فرقہ وارانہ جھگڑے ختم ہو جائیں۔

میں نے کہا کہ ان لوگوں کا ایسا کہنا درست نہیں۔ سماجی امن کے لیے اصل چیز ٹالرنس کی اسپرٹ ہے نہ کہ یہ عقیدہ کہ ہر مذہب یا ہر نظریہ سچا ہے۔ مثلاً یہاں امریکہ میں آپ دیکھئے، اکیڈمک حلقہ میں کوئی متشددانہ لڑائی نہیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ہر اسکالر دوسرے اسکالر کے نقطۂ نظر کو درست مانتا ہے۔ بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اختلاف کے باوجود وہ ایک دوسرے کا احترام کرتے ہیں۔ اختلاف کے وقت وہ کہہ دیتے ہیں:

Let us agree to disagree

میں نے کہا کہ ٹالرنس کی اہمیت اسلام میں بھی اتنا ہی ہے جتنا کہ ہندوازم میں۔ فرق یہ ہے کہ ہندوازم میں ٹالرنس کی بنیاد باہمی اعتراف (mutual recognition) پر ہے اور اسلام میں ٹالرنس کی بنیاد باہمی احترام (mutual respect) پر۔ اس معاملہ میں اسلام کا نقطۂ نظر عین وہی ہے جو سائنٹفک کمیونٹی میں عملاً رائج ہے۔

اسلامک سنٹر میں عربی اخبار المسلمون (۵ مئی ۱۹۹۵) دیکھا۔ اس میں ایک رپورٹ فلسطین کے بارہ میں چھپی ہوئی تھی۔ اس کا عنوان یہ تھا کہ قدس اسلامی امت کو پکار رہا ہے: القدس تستصرخ الامۃ الاسلامیۃ۔

ایک صاحب سے بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ اس طرح کا عنوان ظاہر کرتا ہے کہ فلسطین کے معاملہ میں امت نے کچھ نہیں کیا، اور اب فلسطین مسلمانوں کو مدد کے لیے پکار رہا ہے۔ مگر یہ سراسر خلاف واقعہ بات ہے۔ ۱۹۴۸ میں جب فلسطین کا مسئلہ پیدا ہوا تو شیخ حسن البنا نے قاہرہ میں پرجوش تقریر کرکے ایک جلوس نکالا۔ اس جلوس میں ایک لاکھ سے زیادہ مصری شریک تھے۔ جلوس کا نعرہ یہ تھا کہ اے فلسطین، ہم حاضر ہیں: لبیك یا فلسطین۔

اس کے بعد فلسطینیوں، عربوں اور ساری مسلم دنیا نے اس محاذ پر ہر قسم کی بے پناہ قربانیاں دی ہیں۔ اس کے باوجود مسلمانوں نے فلسطین کے محاذ پر مزید کھو دیا۔ ان کی قربانیاں انھیں کچھ بھی دلانے میں کامیاب نہیں ہوئیں۔ گویا آج مسئلہ یہ نہیں ہے کہ مسلمان فلسطین کی مدد کے لیے نہیں دوڑے۔ بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ مدد کے لیے دوڑ پڑنے کے باوجود انھیں ناکامی

کے سوا اور کوئی چیز حاصل نہیں۔ گویا آج اصل مسئلہ یہ نہیں ہے کہ امت کو فلسطین کی مدد کے لیے پکارا جائے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ یہ غور کیا جائے کہ مسلمانوں کی کامل مدد کے باوجود ان کی مدد مفید کیوں نہیں ہوئی۔

۶ ستمبر کو ماؤنٹ ہالی کے اسلامک سنٹر میں ڈاکٹر نجم اختر (۳۲ سال) سے ملاقات ہوئی۔ (Tel. 301-3360241) انھوں نے الکٹرانک کمیونی کیشن میں ڈاکٹریٹ تک تعلیم حاصل کی ہے۔ وہ امریکہ کی ایک بڑی کمپنی لاک ہیڈ مارٹن (Locheed Martin) میں ہیں۔ یہ کمپنی فوجی اہمیت کے سامان تیار کرتی ہے۔ انھیں یہودیوں کے ساتھ کام کرنا پڑتا ہے۔ اب وہ یہاں سے چھوڑ کر سعودی عرب جا رہے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ یہودیوں کی ترقی کا راز کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ وہ بہت پارٹی ورکر ہوتے ہیں اور بہت لگن والے (extremely dedicated) ہوتے ہیں یہی ان کی ترقی کا اصل راز ہے۔

دوسری بات یہ کہ یہودیوں میں قومی سوچ بہت زیادہ ہے۔ کوئی یہودی خواہ وہ کہیں بھی ہو، وہ ہمیشہ اسرائیل کے بارہ میں سوچ رہا ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ مذہب کو بھی اس معاملہ میں رکاوٹ نہیں بناتا۔ اس کی سوچ یہ ہوتی ہے کہ مسلمان اگر میرے کام کا ہے تو میں مسلمان کو لوں گا، یہودی کو نہیں لوں گا۔ وہ صرف یہ دیکھتے ہیں کہ ان کے کام کے لیے بہترین آدمی کون ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ میرا انٹرویو ہوا تو کل پانچ امیدوار تھے۔ ان میں ہندو، عیسائی، یہودی سب تھے۔ میں اکیلا مسلمان تھا۔ مگر انھوں نے میرا انتخاب کیا۔ انھوں نے کہا کہ یہاں کوئی آپ کو نماز پڑھنے سے نہیں روکتا۔ مگر لوگ خود نماز چھوڑ دیتے ہیں۔ وہ سوچتے ہیں کہ مجھے دوسروں کے جیسا ہونا چاہیے۔ وہ اس میں اپنا فائدہ سمجھتے ہیں کہ وہ دوسروں سے الگ نہ دکھائی دیں۔ انھوں نے کہا کہ اگر کوئی مسلمان یہ کہتا ہے کہ اس کے ساتھ یہودی کمپنی میں تعصب کیا گیا تو وہ غلط کہتا ہے۔ وہ اپنی کمزوری کا الزام دوسرے کے اوپر ڈال رہا ہے۔

نیویارک میں میرا قیام خواجہ کلیم الدین ایم ایس سی کے مکان (بروکلین) میں تھا۔ ۵ ستمبر ۱۹۹۶ کی صبح کو یہاں سے روانگی ہوئی۔ راستہ میں ہم لوگ چند پل سے گزرے۔ معلوم ہوا کہ نیویارک میں ۶۷ واٹر کراسنگ ہیں۔ نیویارک مختلف جزیروں پر واقع ہے۔ ایک جزیرہ سے دوسرے

جزیرہ میں آنے جانے کے لیے بہت سے راستے بنائے گئے ہیں۔ کچھ پانی کے اوپر سے پل کی صورت میں اور کچھ پانی کے نیچے سے سرنگ کی صورت میں۔ دونوں قسم کے راستوں کے لیے ایک مشترک لفظ واٹر کراسنگ ہے۔

خواجہ کلیم الدین صاحب نے بتایا کہ نیویارک میں انھوں نے ایک عرب سے ملاقات کی۔ ان کو الرسالہ مشن کی کچھ کتابیں دیں اور کہا کہ اس ملک میں ہمیں دعوت کا کام کرنا چاہیے۔ اس طرح ہم نہ صرف اپنے پڑوسیوں کا حق ادا کریں گے بلکہ دعوت کے ذریعہ ہمیں دوسری قوموں کے افراد حاصل ہوں گے جو ہمارے لیے بے حد کارآمد ثابت ہوں گے۔ مذکورہ عرب نے جواب دیا کہ یہ تو ایک رسکی کام ہے۔ کیا معلوم کہ اسی بہانے دشمن قوم کے افراد ہمارے اندر داخل ہو جائیں تاکہ وہ ہمارے راز دریافت کریں اور اندر سے ہمیں نقصان پہنچائیں۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا عام تصور یہ ہے کہ تمام قومیں ہماری دشمن ہوگئ ہیں اور وہ ہمارے خلاف سازش کرتی رہتی ہیں۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ خود یہ تصور شیطان کی سب سے بڑی سازش ہے۔ شیطان چاہتا ہے کہ ہم کو مدعو قوموں سے متنفر کر دے تاکہ ہم ان کے اوپر اسلام کی دعوت کا کام کرنے کا خیال ہی چھوڑ دیں۔ خواجہ کلیم الدین صاحب نے کہا کہ یہ (Them versus us) کا تصور ہے جو قومی ہے نہ کہ اسلامی۔

نیویارک میں خواجہ کلیم الدین صاحب کے یہاں ایک روز میں کھانے کی میز پر تھا۔ ان کے چھوٹے صاحب زادے لقمان میاں ایک پلیٹ لائے اور اس کو میرے سامنے رکھ دیا۔ مرغ کے گوشت سے بھرا ہوا تھا۔ انھوں نے کہا کہ اس میں سے لیجئے۔ میں نے پلیٹ کو اپنے سامنے سے ہٹاتے ہوئے کہا: mere sight is horrible ۔ وہ میرے ہندستانی لہجہ کو پوری طرح سمجھ نہ سکے۔ مزید وضاحت کے بعد انھوں نے اس بات کو اپنی زبان میں اس طرح کہا:

Even looking at it makes me feel sick.

سوال کے جواب میں میں نے بتایا کہ بوقت ضرورت میں گوشت بھی کھا سکتا ہوں۔ مگر میں پیدائشی اعتبار سے ویجیٹیرین ہوں۔ میری والدہ اگرچہ گوشت کھاتی ہیں، مگر میرے والد مکمل طور پر ویجیٹیرین تھے جن کا انتقال ۱۹۲۹ میں ہوگیا۔ میری چچازاد بہن مریم مرحومہ کا یہ حال تھا

کہ جس چمچہ سے گوشت نکالا گیا ہو اس چمچہ سے اگر دال یا سبزی نکالی جائے تب بھی وہ اس کو نہیں کھا سکتی تھیں۔ اس طرح میرے خاندان میں کئی عورت اور مرد ویجیٹیرین رہے ہیں۔ تاہم میں بائی برتھ ویجیٹیرین ہوں نہ کہ بائی چوائس۔

۵ ستمبر ۱۹۹۶ —— اس وقت میں ماؤنٹ ہالی (Mount Holly) کے اسلامک سنٹر میں ہوں۔ یہ ایک خوب صورت دنیا ہے جو فطرت کی خوب صورت تر دنیا میں واقع ہے۔ چاروں طرف فطرت کا سرسبز حسن پھیلا ہوا ہے۔ یہ ایک پرسکون ماحول ہے جس میں کسی چڑیا کی آواز سنائی دیتی ہے اور کبھی قریب کی سڑک سے گزرنے والی کسی کار کی آواز۔

پچھلے ۲۵ سال میں مسلمانوں نے امریکہ میں اس طرح کے تقریباً ایک ہزار اسلامک سنٹر بنائے ہیں۔ یہ سنٹر آبادیوں کے عین درمیان بھی ہیں اور موجودہ سنٹر کی طرح آبادی کے ہر پرسکون مقام پر بھی۔ میں نے ایک تقریر میں کہا کہ دور اول میں صحابہ کرام اطراف کے ملکوں میں پھیل گئے۔ یہی وجہ ہے کہ مکہ اور مدینہ میں صحابہ کی قبریں بہت کم پائی جاتی ہیں۔ مثلاً حضرت خالد کی قبر شام میں ہے اور حضرت معاذ بن جبل کی قبر اردن میں۔ اسی طرح صحابہ کرام کی زیادہ تعداد ایشیا اور افریقہ کے مختلف ملکوں میں جاکر آباد ہوگئی

یہ دراصل جذبۂ دعوت تھا جس نے انھیں عرب کے باہر مختلف ملکوں میں پہنچا دیا۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا کیس بھی یہی ہے۔ یہ مسلمان ابتدائی طور پر جب یہاں آئے تو وہ معاش کے جذبہ کے تحت آئے۔ مگر حالات نے انھیں مجبور کیا کہ وہ یہاں اپنی اسلامیت کو زندہ کریں۔ کیوں کہ انھیں محسوس ہوا کہ اگر ہم نے اپنی اسلامی شناخت کھودی تو ہم یہاں بالکل بے جگہ ہو کر رہ جائیں گے۔ اب انھوں نے مسجدیں اور ادارے اور سنٹر بنانے شروع کردیے۔ اس طرح اب یہی ہوتا جارہا ہے کہ عملاً وہ یہاں اسلام کے نمائندہ اور داعی بن کر رہیں۔

مولانا محمد ذکی الدین شرفی نوجوانی کی عمر سے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی تحریریں پڑھتے رہے ہیں۔ وہ ان کے گہرے معتقد ہیں۔ ایک روز انھوں نے ایک بات کہی۔ پھر میری فرمائش پر حسب ذیل الفاظ کاغذ پر لکھ کر مجھے دیے: مولانا مودودی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے جدید ریاست (modern state) کے تناظر میں قرآن کا تصور توحید

انتہائی تسلسل، وضاحت اور یقین محکم کے ساتھ بیان کیا (۶ستمبر ۱۹۹۶)

اس عبارت میں جس چیز کو "جدید ریاست" کہا گیا ہے، وہ دراصل ریاست کا کمیونسٹ تصور تھا جو عرصہ ہوا ختم ہو گیا۔ مارکس نے ریاست کو ایک ہمہ گیر اور کلی ادارہ کے طور پر پیش کیا تھا۔ انیسویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں صدی کے نصف اول میں اس فکر کا غلغلہ بلند ہوا۔ مولانا مودودی، بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح، اس سے متاثر ہوئے اور اسلام کے تصور توحید میں سیاسی حاکمیت کا تصور شامل کر کے اسلام کو ایک کلی ریاست کے روپ میں پیش کیا۔ مگر یہ قرآن کا تصور توحید نہیں تھا بلکہ وہ قرآن کی کچھ آیتوں کی غلط اور غیر علمی تفسیر تھی (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، تعبیر کی غلطی)

ریاست کا جدید تصور، مارکسی تصور سے بالکل مختلف ہے۔ جدید سیکولر جمہوری نظام میں ریاست سمٹ کر" انتظامیہ" کے ہم معنی بن گئی ہے۔ ایڈمنسٹریشن کے باہر تقریباً تمام شعبے آزاد انسانی شعبے کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ مولانا مودودی اپنے حال میں گرفتار تھے اور ان کے معتقدین ماضی میں گرفتار ہیں۔ اول الذکر کا کیس اگر مرعوبیت کا کیس ہے تو ثانی الذکر کا کیس شخصیت پرستی کا کیس۔

۶ستمبر کی شام کو میں ماونٹ ہالی کے سنٹر میں اوپر کی منزل میں واقع اپنے کمرہ میں لکھنے پڑھنے کے کام میں مشغول تھا کہ مجھے بتایا گیا کہ دو ہندو صاحبان آپ سے ملنے کے لیے آئے ہیں۔ مجھے تعجب ہوا یہاں میری موجودگی کا علم ان کو کس طرح ہوا۔ ملاقات ہوئی تو معلوم ہوا کہ وہ مسٹر کملیش شاہ (Tel. 908-3294006) اور مسٹر بھرت جانی (Tel. 908-2831863) ہیں۔ میں ان کو بالکل جانتا نہیں تھا۔ ان کو بمبئی سے مہیش بھائی نے خبر دی تھی کہ اس وقت میں امریکہ میں ہوں۔ انھوں نے مختلف جگہوں پر ٹیلی فون کر کے میرا پتہ معلوم کیا اور پھر یہاں پہنچ گئے۔

یہ لوگ ایک بہت بڑی تحریک سے وابستہ ہیں۔ اس کا سنٹر بمبئی میں ہے۔ امریکہ کی تقریباً ہر ریاست میں ہزاروں ہندو ان کی تحریک سے وابستہ تھے۔ وہ ایک بڑا اجتماع یہاں کرنا چاہتے تھے اور ان کی خواہش تھی کہ میں اس میں اپنے خیالات پیش کروں۔ مگر طے شدہ پروگرام کی بنا پر کسی بڑے اجتماع کے لیے میں وقت نہیں دے سکتا تھا۔

سوال و جواب

سوال

کہا جاتا ہے کہ قرآن کو سمجھنے کے لئے ۸۰ علوم درکار ہے۔ ان ۸۰ علوم میں مہارت کے بغیر قرآن کو سمجھنا ممکن نہیں۔ ایسی حالت میں سوال یہ ہے کہ عام مسلمان کس طرح اسلام کو سمجھیں۔ کیا قرآن صرف ماہرین علوم کے لئے اترا ہے، عام انسانوں کے لئے نہیں۔ عام لوگوں کا کام صرف یہ ہے کہ سمجھے بغیر قرآن کے الفاظ کی تلاوت کرتے رہیں، اور قرآن کو سمجھنے کا کام ماہرین علوم کے لئے چھوڑ دیں ۔ (عبدالسلام اکبانی، ناگپور)

جواب

"۸۰ علوم" میں مہارت کا نظریہ نہ قرآن و حدیث میں کہیں ملتا ہے اور نہ وہ کسی صحابی سے منقول ہے۔ اس کے برعکس قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ، اللہ تعالی نے قرآن کو آسان بنادیا تاکہ لوگ اسے سمجھیں (القمر ۴۰) ایسی حالت میں قرآن فہمی کا مذکورہ نظریہ خود قرآن کے خلاف ہے۔ مزید یہ کہ یہ قابل عمل بھی نہیں۔ اسلام کی چودہ سو سال کی تاریخ میں کوئی اسلامی شخصیت یا کوئی عالم ایسا نہیں جو ان مفروضہ ۸۰ علوم میں کامل مہارت رکھتا ہو۔ اب اگر مذکورہ اصول کو مان لیا جائے تو یہ بھی کہنا پڑے گا کہ اسلام کی پوری تاریخ میں کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں گذرا جو قرآن کو حقیقی طور پر سمجھے اور اس کی توضیح و تفسیر کرے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن فہمی کے لئے اصلاً صرف دو چیزوں کی ضرورت ہے۔ ایک، عربی زبان کی بخوبی واقفیت، اور دوسرے وہ چیز جس کو قرآن میں تقوی کہا گیا ہے، (البقرہ ۲۸۲) یعنی حسن نیت، سنجیدگی اور سچی طلب۔ عربی زبان سے بخوبی واقفیت آدمی کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ قرآن کے بیانات کا بنیادی فہم حاصل کر سکے۔ اور تقوی اس بات کا ضامن ہے کہ وہ دوسرے ضروری ماخذوں سے بھرپور

استفادہ کرے مثلاً حدیث سے۔ اور اسی کے ساتھ وہ اس حد تک سنجیدہ ہو کہ اس غلطی سے بچ جائے جس کو تفسیر بالرائے کہا جاتا ہے۔

سوال

دعوت کے دو طریقے ہیں۔ ایک، "قولی دعوت" اور دوسرے "فعلی دعوت"، فعلی دعوت کے بغیر دعوت کا عمل بے فائدہ ہے۔ مسلمان جب تک اپنے اخلاق وافعال سے اسلام کا مظاہرہ نہ کریں، محض تقریر وتحریر کے ذریعہ کوئی شخص اسلام سے قریب آنے والا نہیں۔ اس لئے دعوتی مقصد کے تحت پہلا کام یہ ہے کہ مسلمانوں کے اخلاق واعمال اور سیرت وکردار کو درست کیا جائے۔ مسلمانوں کی عملی اصلاح کے بغیر صرف قولی دعوت کا کوئی فائدہ نہیں (محمد یعقوب، حیدر آباد)

جواب

قولی دعوت اور فعلی دعوت کی تقسیم سراسر بے بنیاد ہے، قرآن وحدیث میں کہیں بھی اس کا ذکر نہیں۔ فعل بلاشبہ مطلوب ہے، مگر اس کا محرک ذاتی اصلاح ہے نہ کہ دعوت وتبلیغ۔ مثلاً روایات سے ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ غیر مسلموں کے مجمع میں جاتے اور ان کو خطاب کرتے ہوئے کہتے کہ، اے لوگو لا الہ الا اللہ کہو تم فلاح پاؤ گے (ایها الناس قولوا لااله الا الله تفلحوا) مگر قرآن وحدیث میں کہیں بھی یہ حکم نہیں آیا ہے کہ اے مسلمانوں، تم عمل صالح کرو تاکہ اس کو دیکھ کر لوگ اسلام میں داخل ہو جائیں۔ یہ ایک خلاف واقعہ بات مشہور ہے کہ دور اول میں لوگ مسلمانوں کے اخلاق کو دیکھ کر اسلام میں داخل ہو گئے۔ اگر ایسا ہوتا تو کسی پیغمبر کو کبھی مخالفت کا سامنا کرنا نہ پڑتا۔ اصل یہ ہے کہ دور اول کے مسلمانوں کے دل دوسروں کی نفرت سے خالی تھے۔ انہوں نے کسی سے مادی جھگڑا

بھی نہیں کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان معتدل فضا میں ملاقاتیں ہونے لگیں۔ اس دوران فطری طور پر اسلام زیر بحث آنے لگا۔ معتدل فضا میں یہی تفاعل (interaction) دعوت کے کام میں سب سے زیادہ مددگار ہے۔ موجودہ زمانہ میں اسلام کی عمومی اشاعت رک جانے کا سبب مسلمان کی بے عملی نہیں ہے۔ بلکہ اس کا تمام تر سبب یہ ہے کہ مسلمانوں کی قومی اور مادی تحریکوں نے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان نفرتیں پیدا کردیں۔ اس کے نتیجہ میں دونوں کے درمیان معتدل فکری تعلق باقی نہ رہا۔ اب دعوت کے مواقع کھولنے کے لئے کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان نفرت کو ختم کیا جائے۔ جیسے ہی نفرت کی فضا ختم ہو گی اسلام کا فطری پیغام لوگوں کے دلوں میں داخل ہونا شروع ہو جائے گا۔

سوال

قرآن کی سورہ المائدہ میں ارشاد ہوا ہے۔ ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاو لئک ھم الکفرون (المائدہ ٤٤)اس آیت کو جب میں پڑھتا ہوں تو پریشان ہو جاتا ہوں کہ آج ہم قرآن کریم کے مطابق فیصلے نہیں کرتے ۔ ہماری عدالتوں میں، ہمارے دیگر معاملات میں فیصلے قرآن کریم کے خلاف ہوتے ہیں آپ اس سلسلہ میں ہماری رہنمائی فرمائیں کہ کیا واقعتہً ہی ہم کافر ہو گئے ہیں۔ کیا ہم اس حالت میں جو آج ہندستان میں رائج ہے جنت کے مستحق ہو سکتے ہیں (صدرالدین، پونچھ کشمیر)

جواب

اس آیت کا تعلق اجتماعی نظام سے نہیں ہے بلکہ فرد کے ذاتی عمل سے ہے۔ یعنی اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہندستان میں یا اس قسم کے دوسرے ملکوں میں قائم شدہ سیاسی

نظام سے لڑ کر اس کو بدلا جائے اور عدالتوں میں اسلامی قانون کے متعلق فیصلے کروائے جائیں۔ اس قسم کے کسی نام نہاد انقلابی نظریہ کا اس آیت سے کوئی تعلق نہیں۔ اس آیت کا خطاب تمام تر فرد سے ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک مسلمان کے ساتھ جب کوئی معاملہ پیش آئے تو وہ اس کے بارے میں شریعت کا مسئلہ معلوم کرے، خواہ علماء کے ذریعہ یا دار الافتاء کے ذریعہ۔ اور جب شریعت کا مسئلہ معلوم ہو جائے تو پوری آمادگی کے ساتھ اس کو اختیار کر لے۔ مسلمان کو ایسا نہیں کرنا چاہئے کہ جو چیز شرعی قانون کے تحت اس کا حق نہیں ہے اس کو پانے کے لئے وہ ناحق طور پر ملکی عدالت میں پہنچ جائے اور جو چیز اس کو خدائی قانون کے تحت نہیں مل رہی تھی اس کو وہ انسانی قانون کی مدد سے حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ وہ تمام افراد اس آیت کا مصداق ہیں جو اپنے نزاعات کو اسلامی اصول کے تحت طے نہیں کرتے بلکہ اس کو لے کر ملکی عدالتوں میں پہنچ جاتے ہیں تاکہ وہاں سے من مانا فیصلہ حاصل کر سکیں۔ اور شرعی قانون کے تحت جو چیز ان کا حق نہیں ہے اس کو وضعی قانون کی مدد سے اپنے لئے حاصل کر لیں۔

سوال

آپ اپنی تحریروں اور تقریروں میں ہمیشہ ایڈجسٹمنٹ کی بات کرتے ہیں، آپ دوسروں کو تلقین کرتے ہیں کہ وہ نزاع کے موقع پر ایڈجسٹ کر کے رہیں۔ مگر آپ کا اپنا عمل اس کے خلاف ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ دوسری اسلامی شخصیتوں سے جب آپ کا کوئی اختلاف ہوتا ہے تو آپ فوراً ان کے خلاف تنقید شروع کر دیتے ہیں۔ حالانکہ ایڈجسٹمنٹ کے فلسفہ کے مطابق، آپ کو ان کی تنقید یا مخالفت نہیں کرنا چاہئے۔ (ظہیر احمد صدیقی ندوی، لکھنؤ)

جواب

ایڈ جسٹمنٹ کا تعلق عمل سے ہے نہ کہ قول سے، یعنی دو آدمیوں کے درمیان کسی معاملہ میں نزاع پیدا ہو تو اس کی وجہ سے انہیں ایسا نہیں کرنا چاہئے کہ وہ ایک دوسرے سے لڑنے لگیں۔ انہیں قول کے دائرہ میں رہتے ہوے ایک دوسرے کے سامنے اپنے نقطہ نظر کا اظہار کرنا چاہئے۔ اختلاف کو عملی ٹکراؤ تک نہیں لے جانا چاہئے، عملی ٹکراؤ سے ہمیشہ طرح طرح کے نقصانات پیدا ہوتے ہیں، مگر سنجیدہ قولی اختلاف غیر معمولی فائدوں کا باعث ہے۔ اگر کسی سماج میں قولی اختلاف یا تنقید کو ختم کر دیا جائے تو ایسے لوگوں کا ذہنی ارتقا رک جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں ظالم حکمراں کے خلاف قولی اعلان کو افضل جہاد بتایا گیا ہے۔ مگر اسی ظالم حکمراں کے خلاف عملی خروج یا پر تشدد مخالفانہ کارروائی کو حرام قرار دیا گیا ہے۔

سوال

آپ کی کتاب فکر اسلامی پڑھی یہ پوری کتاب مجھے قابل اعتراض نظر آئی اس لئے کہ آپ اس کتاب کے مطابق یہ چاہتے ہیں کہ اسلام کو زمانہ حاضر کے مطابق ڈھالیں۔ حالانکہ اسلام کا تقاضا یہ ہے کہ زمانہ کو اسلام کے مطابق ڈھالا جائے۔ (مفتی نذر توحید مظاہری و مفتی شعیب قاسمی، چترا بہار)

جواب

یہ محض ایک غلط فہمی ہے۔ اس کتاب کا موضوع اجتہاد ہے۔ اجتہاد کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ اسلام کو زمانہ حاضر کے مطابق بنایا جائے۔ بلکہ اجتہاد کا مقصد ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ بدلے ہوئے حالات میں از سر نو اسلام کو منطبق کرنے کی کوشش کی جائے۔ رسول اللہ

ﷺ نے صحابہ کی ایک جماعت کو مدینہ سے بنو قریضہ کی بستیوں کی طرف بھیجا اور فرمایا کہ تم لوگ بنو قریضہ پہنچنے سے پہلے عصر کی نماز ہرگز نہ پڑھنا۔ لیکن راستہ میں ان صحابہ کو محسوس ہوا کہ غروب آفتاب قریب آچکا ہے اور اگر انہوں نے راستہ میں عصر کی نماز نہ پڑہی تو بنو قریضہ پہنچنے تک اس کا وقت ختم ہو جائے گا۔ چنانچہ انہوں نے بظاہر حکم رسول کی خلاف ورزی کرتے ہوئے راستہ میں عصر کی نماز پڑھ لی۔ صحابہ کا یہ عمل اسلام کو حالات کے مطابق ڈھالنا نہیں تھا بلکہ بدلے ہوئے حالات میں اسلام کو از سر نو منطبق کرنا تھا۔ اسی کا نام اجتہاد ہے۔ یہ اجتہاد زندگی کی ایک فطری ضرورت ہے۔ وہ ہر حال میں اور ہمیشہ جاری رہے گا۔ مذکورہ کتاب میں اسلامی شریعت کے اسی پہلو کو زمانہ حاضر کی نسبت سے واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

سوال

افغانستان میں طالبان اس اعلان کے ساتھ لڑ رہے ہیں کہ وہ اقتدار حاصل کر کے اسلامی قانون نافذ کریں گے۔ اس کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے (محمد خالد ندوی)

جواب

حضرت عائشہ کا قول ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے پہلے دلوں کو بدلا اور اس کے بعد شرعی قانون کا نفاذ فرمایا۔ افغانستان کے طالبان اس کے برعکس بم اور گن کے ذریعہ اسلامی قانون نافذ کرنا چاہتے ہیں۔ یہی فرق یہ ثابت کرنے کیلئے کافی ہے کہ طالبان اسلامی قانون کے نفاذ میں کبھی کامیاب نہیں ہوں گے۔ وہ اپنی انتہا پسندانہ اور متشددانہ کارروائیوں کے ذریعہ افغانستان میں جو چیز لائیں گے وہ صرف تباہی ہو گی۔ وہ نہ کوئی مادی تعمیر کر سکیں گے اور نہ اسلامی تعمیر۔

۱۔ ۲۳؍جون ۱۹۹۸ کو زی ٹی وی (نئی دہلی) نے صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو ریکارڈ کیا۔ سوالات کا تعلق اجودھیا کی بابری مسجد سے تھا۔ جوابات کا خلاصہ یہ تھا کہ نزاعات ہر سماج میں پیدا ہوتے ہیں۔ مگر مہذب سماج میں اس کا طریقہ یہ ہے کہ اس کو یا تو پرامن گفت وشنید کے ذریعہ طے کیا جائے یا کورٹ کے ذریعہ۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ یہ کہنا درست نہیں کہ یہ عقیدہ کا مسئلہ ہے اس لئے اس کا تعلق عدالتی فیصلہ سے نہیں۔ اگر آپ رام کو بھگوان کہیں تو یہ بلاشبہ عقیدہ کا مسئلہ ہے اور کوئی عدالت اس معاملہ میں فیصلہ نہیں دے سکتی مگر جب آپ یہ کہتے ہیں کہ رام فلاں خاص جگہ پیدا ہوئے تو یہ ایک تاریخی بیان ہوتا ہے نہ کہ کوئی اعتقادی بیان۔ اسی طرح جب آپ یہ کہتے ہیں کہ فلاں جگہ ایک مندر تھا اور فلاں حاکم نے اس کو توڑ کر مسجد بنایا تو یہ بھی ایک تاریخی بیان ہوتا ہے اور جس بیان کی حیثیت تاریخی ہو اس کو تاریخی شہادتوں کی بنیاد پر ہی طے کیا جاسکتا ہے۔

۲۔ ۲۶؍جون ۱۹۹۸ کو دوردرشن (نئی دہلی) پر ایک پینل ڈسکشن تھا۔ اس کا موضوع تھا مشترک کلچر کے سماج میں اتحاد کیسے حاصل ہو۔ صدر اسلامی مرکز نے اس کی دعوت پر اس میں شرکت کی۔ انہوں نے جو کچھ کہا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ سماجی اتحاد کا راز یہ نہیں ہے کہ اختلافات کو مٹا کر یکسانیت لائی جائے۔ فرق اور اختلاف فطرت کا حصہ ہیں۔ اس لئے سماجی اتحاد کا راز صرف ایک ہے اور وہ ٹالریشن اور باہمی احترام ہے۔

۳۔ آریہ سماج مندر (دہلی) میں ۵؍جولائی ۱۹۹۸ کو شراب بندی پر ایک جلسہ تھا، جس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور ایک تقریر کی۔ وہاں ایک امریکی

جرنلسٹ بھی موجود تھے انہوں نے شراب کے بارے میں اسلام کے نقطۂ نظر پر انٹرویو لیا۔اس سلسلہ میں شراب کااسلامی حکم بتایا گیا۔

۴۔ انگریزی اخبار مڈڈے (نئی دہلی) کے ایڈیٹر مسٹر جان پال نے صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ یہ انٹرویو مڈڈے کے شمارہ ۱۳جولائی ۱۹۹۸میں چھپ چکا ہے۔اس انٹریو کا عنوان یہ تھا

The nuclerar bomb has no religion

۵۔ ہندی ہفتہ وار انڈین جنگ کے ایڈیٹر آلوک موہن نے یکم اگست ۱۹۹۸کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر آزادی کے بعد کے پچاس سال سے تھا۔ اس مدت میں ملک نے کیا کھویا کیا پایا۔ جوابات کا خلاصہ یہ تھا کہ اس مدت میں ملک نے پایا بہت کم اور کھویا بہت زیادہ۔

۶۔ ذی ٹی وی کی ٹیم ۴اگست کو اسلامی مرکز میں آئی،اور صدر اسلامی مرکز کا انٹر ویو لیا۔ سوالات کا تعلق ملک اور ملت دونوں قسم کے مسائل سے تھا۔ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ ملکی ترقی اور سماجی تعمیر کے لئے سب سے اہم چیز ایجو کیشن ہے۔ ملک کے بیشتر لوگ اگر تعلیم یافتہ ہو جائیں تو ملک کے مسائل اپنے آپ حل ہو جائیں گے۔

تذکیر القرآن

نئی طباعت
ایک جلد میں مکمل

قرآن کی بے شمار تفسیریں ہر زبان میں لکھی گئی ہیں۔ مگر تذکیر القرآن اپنی نوعیت کی پہلی تفسیر ہے۔ تذکیر القرآن میں قرآن کے اساسی مضمون اور اس کے بنیادی مقصد کو مرکزِ توجہ بنایا گیا ہے۔ جزئی مسائل اور معلوماتی تفصیلات کو چھوڑتے ہوئے اس میں قرآن کے اصل پیغام کو کھولا گیا ہے اور عصری اسلوب میں اس کے دعوتی اور تذکیری پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔ تذکیر القرآن عوام و خواص دونوں کے لیے یکساں طور پر مفید ہے۔ وہ طالبینِ قرآن کے لیے فہمِ قرآن کی کنجی ہے۔

ہدیہ : 400 روپے

1600 صفحات، باریک کاغذ پر ایک جلد میں مکمل۔

مساجد اور لائبریری وغیرہ میں تقسیم کرنے کے لئے 5 کاپیاں یا اس سے زیادہ تعداد منگوانے پر

نصف رعایت کے ساتھ صرف 200 روپے میں دستیاب ہے

5 کاپیاں یا اس سے زیادہ تعداد منگوانے پر ڈاک خرچ بھی ادارہ کے ذمہ ہوگا۔
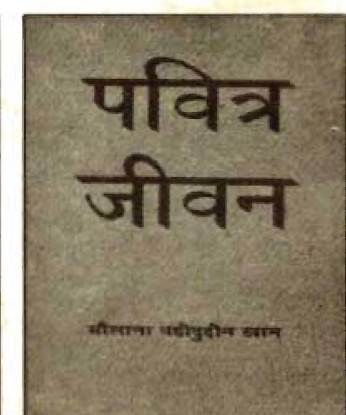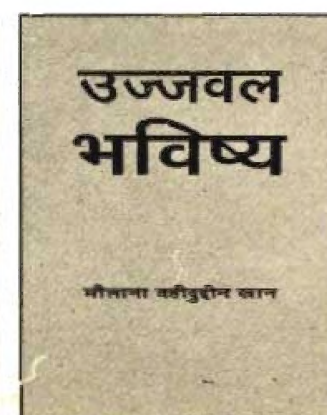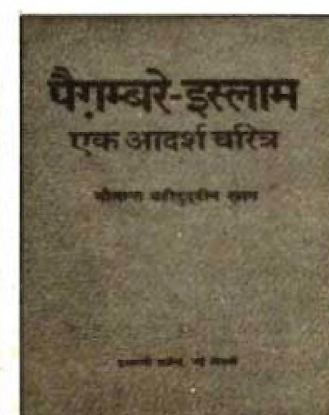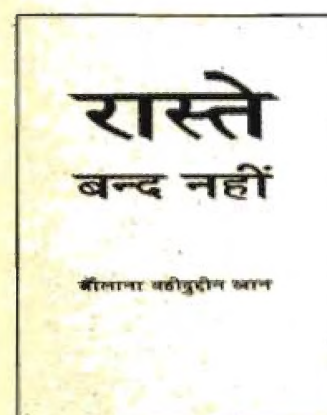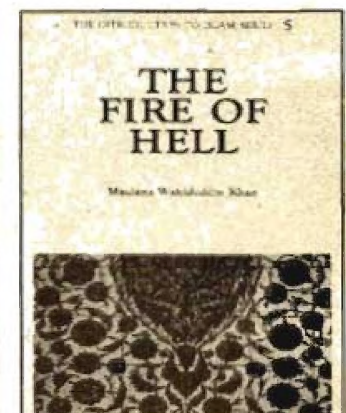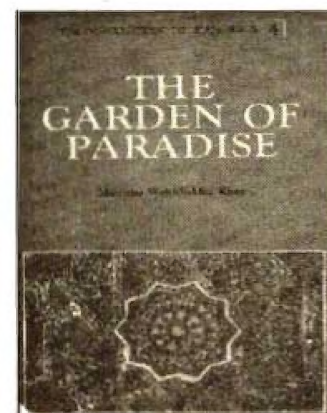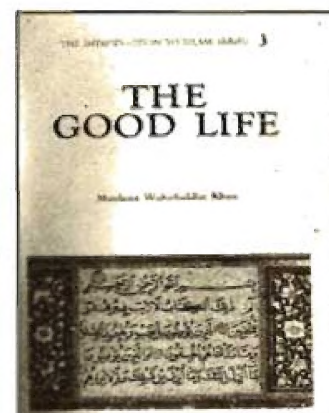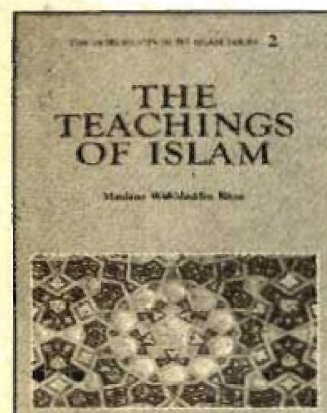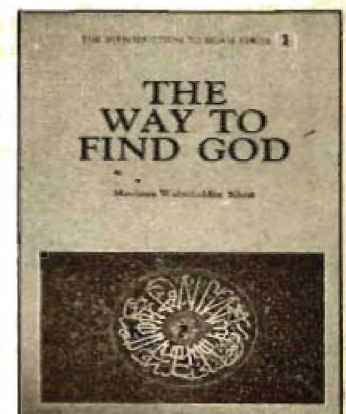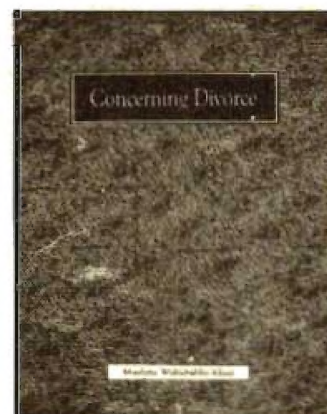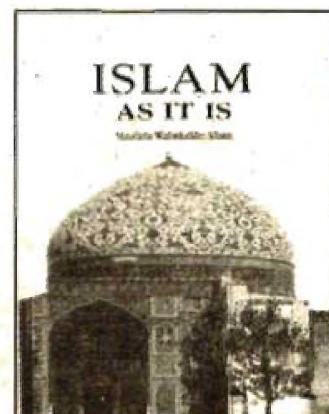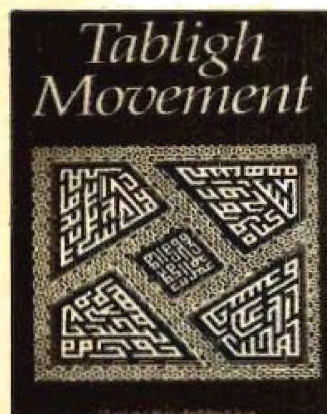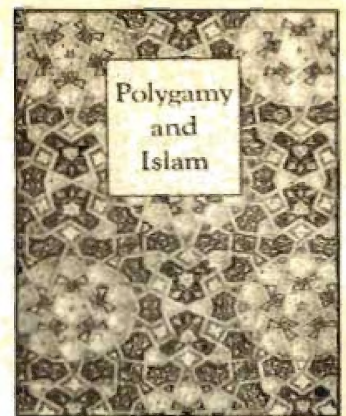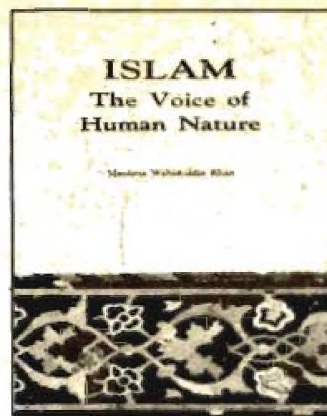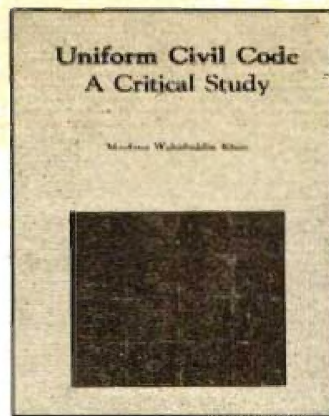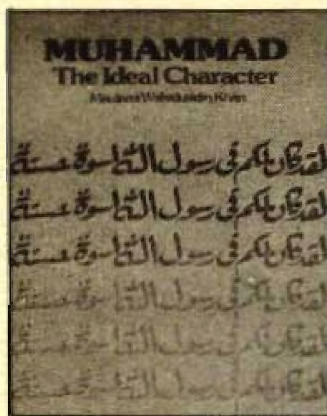
Finest collection of books on Islam
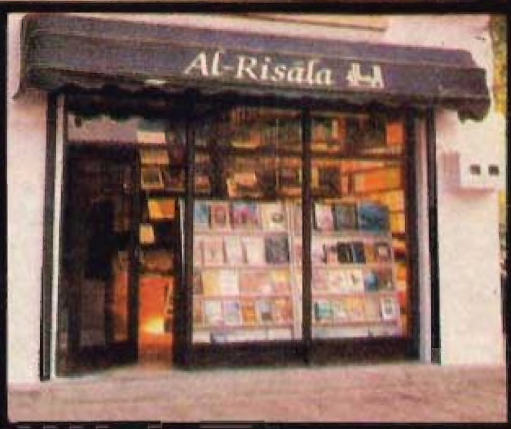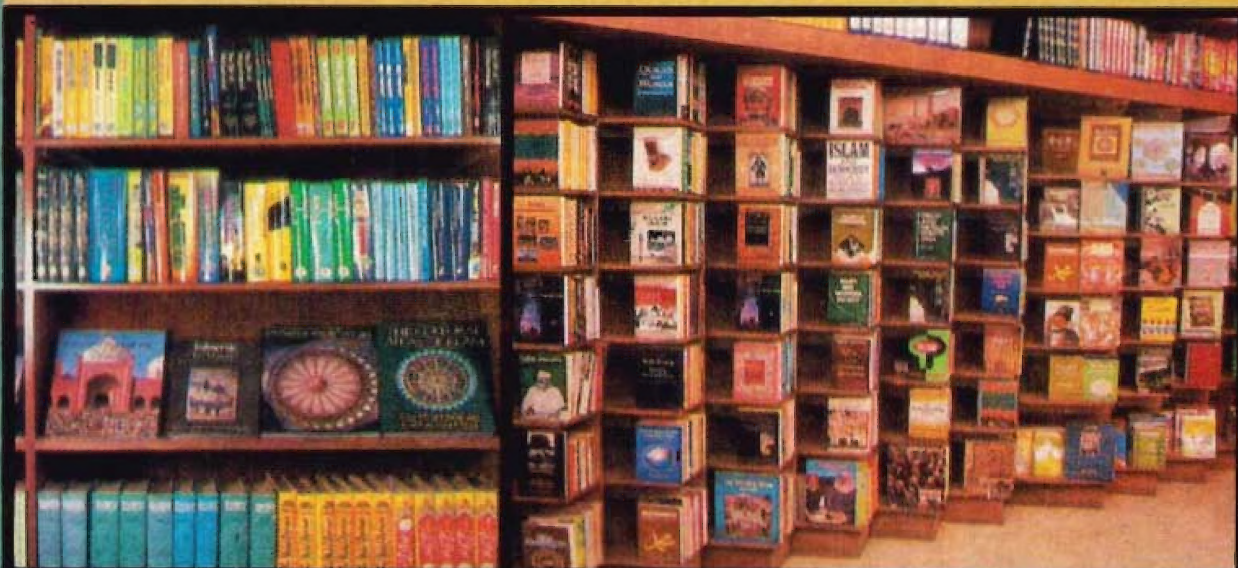
RNI 28822/76 • U(SE) 12/98
Delhi Postal Regd. No. DL/11154/98

AL-RISALA BOOK CENTRE

1, Nizamuddin West Market, Near DVB, New Delhi-110 013

Tel. 4611128, 4611131, Fax 4697333

e-mail: risala.islamic@axcess.net.in, Web: http://www.alrisala.org